جادو کی تلوار

جادو کی تلوار

پولینڈ کی کہانیاں

سیف الدّین حُسام (ایم اے)

فہرست

خوفناک جھونپڑی

بہت دنوں کی بات ہے، ایک عورت تھی جس کا نام این تھا۔ وہ بیوہ تھی۔ اس کی ایک نوجوان بیٹی تھی جس کا نام آریا تھا۔ بیوہ ہونے کے بعد این کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو اس نے ایک شخص ریڈ سے شادی کر لی۔ ریڈ کی بیوی مر چکی تھی، لیکن اس کی بھی ایک بیٹی تھی جس کا نام ماریا تھا اور وہ بھی آریا ہی کی طرح نوجوان تھی۔

این اپنی بیٹی آریا کو بڑے لاڈ پیار سے پالتی۔ اسے اچھے سے اچھا کھانے کو دیتی۔ اچھے اچھے کپڑے پہناتی۔ اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی اور آنکھوں میں سُرمہ لگاتی۔ اسے گھر کا کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ وہ سارا دِن کھیلتی کودتی رہی۔ لیکن ماریا اس کی سوتیلی بیٹی تھی، اس لیے اس بے چاری کی ہر وقت کم بختی آئی

رہتی۔

جو تھوڑا بہت کھانا بچ رہتا وہ ماریا کو کھانے کو ملتا۔ اس کے کپڑے پھٹے رہتے۔ بال سنوارنے کا تو اس بے چاری کو ہوش ہی نہ تھا۔ اس کی سوتیلی ماں تمام دِن اسے گھر کے کام میں لگائے رکھتی۔ اسے کبھی کھیلنے کا موقع نہ ملتا۔ اس کے باوجود اسے اکثر مار پڑتی۔

سوتیلی ماں ہونے کے علاوہ این کو ماریا سے ایک اور دشمنی بھی تھی۔ وہ اتنے پھٹے پرانے کپڑوں میں اور نہائے دھوئے بغیر بھی اتنی خوب صورت اور پیاری لگتی کہ شادی کے لیے جو بھی پیغام آتا وہ اُسی کے لیے آتا۔ آریا کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ این ہر وقت یہی سوچتی رہتی کہ ماریا سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ اور اس کو کس طرح راستے سے ہٹایا جائے تاکہ لوگوں کی توجّہ اس کی اپنی لڑکی آریا کی طرف ہو۔

یہ لوگ ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کے باہر ایک ندی بہتی تھی۔ اس ندی کے کنارے ایک جھونپڑی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی بوسیدہ سی۔ اس

کے اندر مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔ یہ اندر سے اتنی ڈراؤنی تھی کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر اُدھر آ نکلتا تو تھکا ہارا ہونے کے باوجود وہاں رات گزارنے کی جرأت نہ کرتا۔

اس جھونپڑی کے پاس سے جو راستہ گزرتا تھا وہ لوگوں نے مُدّت سے استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ مشہور یہ تھا کہ اس جھونپڑی میں جن بھُوت رہتے ہیں۔ آدھی رات کے بعد اس میں سے ناچنے گانے کی آواز آتی ہے۔ روشنی کبھی جلتی ہے کبھی بجھتی ہے۔

ایک شام سوتیلی ماں نے باریا سے کہا کہ وہ چرخا اور رُوئی اُٹھا کر اُس جھونپڑی میں چلی جائے اور ساری رات وہیں بیٹھ کر چرخا کاتے۔ صُبح تک ساری روئی کا دھاگا بن جانا چاہیے، ورنہ اُسے گھر سے نکال دیا جائے گا۔

اصل میں این کو پتا تھا کہ بہادُر سے بہادُر آدمی بھی اُس جھونپڑی میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔ اس نے سوچا کہ جب ماریا وہاں جائے گی تو جن بھُوت اُسے مار دیں گے اور یوں اس مُصیبت سے نجات

مِل جائے گی۔

ماریا بہت روئی چلاّئی۔ اُس نے سوتیلی ماں کی بہت منّت سماجت کی لیکن اُس پتھّر دِل عورت پر کُچھ بھی اثر نہ ہُوا۔ ماریا رو رو کر چُپ ہو گئی۔ اس نے ایک کندے پر چرخا رکھا، دوسرے پر رُوئی کی گٹھڑی اور آہستہ آہستہ ندی کی طرف چل دی۔

جب وہ جھونپڑی کے پاس پہنچی تو خوف سے کانپنے لگی۔ تیز آندھی چل رہی تھی اور ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس نے حوصلہ کر کے جھونپڑی کا دروازہ کھولا تو چرچراہٹ کی آواز آئی اور وہ کانپ گئی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی روشنی ہو گئی۔ اس کی کُچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے! وہ خاموشی سے زمین پر بیٹھ گئی اور تیزی سے چرخا کاتنا شروع کر دیا تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ساری روئی کا دھاگا بنا لے اور اسے گھر سے نہ نکالا جائے۔

وہ چُپ چاپ چرخا کاتتی رہی۔ آدھی رات تک کوئی خاص بات نہیں ہو ئی۔ آدھی رات کے قریب زور کی آندھی چلنا شروع ہو گئی اور باہر ایسی آواز آئی جیسے کوئی گاڑی آ کر رُکی ہو۔ وہ بہت گھبرائی اور چرخا چھوڑ کے ایک کونے میں دبک گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے! بیٹھی رہے تب بھی مشکل اور اگر بھاگ نکلے تو وہ لوگ اسے دیکھ لیں گے جن کی گاڑی کی آواز آئی تھی۔ وہ سوچنے لگی یا اللہ! میں کیا کروں؟ کوئی مجھے اُٹھا کر نہ لے جائے۔ ویسے تو وہ اپنے گھر میں بہت تنگ تھی اور وہاں

نہیں رہنا چاہتی تھی، لیکن یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کوئی جِن بھُوت اُسے اُٹھا کر لے جائے اور چیر پھاڑ کر کھا جائے۔

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ دو نوجوان لڑکے اندر داخل ہوئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ دروازہ تو بند ہے، یہ لوگ اندر کیسے داخل ہو گئے؟ ان نوجوانوں نے بالکل ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ تنگ کوٹ، تنگ پتلونیں۔ پیروں میں سیاہ بوٹ۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپیاں۔ ان کی آنکھیں ایسی سُرخ تھیں جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ جُوں ہی وہ اندر داخل ہوئے، جھونپڑی میں سازوں کی دِل کش آوازیں گونجنے لگیں۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور موسیقی کی دھن پر ناچتے ہوئے گانے لگے:

ناچیں گے نچائیں گے

لڑکی کو لے جائیں گے

لوٹ کے پھر نہیں آئیں گے

ماریا انہیں حیرت سے دیکھتی رہی اور وہ تالیاں بجا بجا کر ناچتے گاتے رہے۔ جب تھک گئے تو لڑکی کی طرف آئے اور ایک لڑکا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آؤ! ہمارے ساتھ ناچو۔۔۔“

ماریا اب اتنی خوف زدہ نہ تھی۔ پہلے اُسے یہ ڈر تھا کہ خُوف ناک قسم کے بھُوت جھونپڑی میں آئیں گے اور اسے کھا جائیں گے یا اُٹھا کر لے جائیں گے لیکن یہ لڑکے تو بڑے خوب صورت تھے اور اُنہوں نے اسے بالکل تکلیف نہ دی تھی۔ وہ بولی ”آپ لوگوں کے ساتھ ناچنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ذرا میری حالت تو دیکھیے۔ ننگے پاؤں اور پھٹے کپڑوں میں گھر سے نِکلی ہوں۔ ایسی حالت میں آپ کے ساتھ ناچتی اچھی نہ لگوں گی۔“

”تو کیا چاہیے تمہیں؟“ اُنہوں نے پُوچھا۔

ماریا بولی۔ ”سرخ رنگ کی جوتوں کی جوڑی، جس کا تلا مضبوط لیکن ایڑی ہلکی ہو۔“

دونوں لڑکے باہر نکلے اور ماریا کی پسند کا جوتا لے کر فوراً ہی واپس آ گئے۔ پھر اُس نے انہیں ریشمی جرابوں، ریشمی ٹوپی، سنہری ہار اور سُرخ ربن لانے کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد دستانے، پنکھا اور رُومال لانے کے لیے کہا۔ جب وہ یہ سب کُچھ لے کر آ گئے تو ماریا بولی۔ "کیا آپ مُجھے کُچھ پیسے نہیں دیں گے؟"

دونوں لڑکے پھر بھاگے گئے اور روپوں سے بھری ہوئی تھیلی لا کر ماریا کے قدموں میں ڈال دی۔ وہ جب بھی باہر جاتے، ماریا ان کے واپس آنے تک کوئی فرمائش سوچ رکھتی۔ اسے پتا تھا کہ صُبح کی روشنی کے ساتھ ہی یہ لڑکے غائب ہو جائیں گے۔ اب اس کی سمجھ میں کوئی اور بات نہ آ رہی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر لڑکے بولے "اب تو ہم سب کُچھ لا چُکے۔ اب کوئی کسر باقی نہیں رہی ۔ چلو آؤ۔ اب ہمارے ساتھ ناچو۔۔۔۔"

اچانک ماریا کے دماغ میں ایک اور بات آ گئی اور وہ بولی "ہاں اب سب کُچھ آ چکا ہے۔ لیکن مُنہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی بھی تو چاہیے۔ یہ کہہ کر

اُس نے انہیں ایک چھلنی دی کہ اس میں پانی بھر کر لائیں۔"

وہ بھاگے بھاگے ندی پر گئے۔ لیکن جب چھلنی کو بھر کر اوپر اُٹھاتے تو اس میں سے پانی نکل جاتا اور وہ پھر پانی بھرنے لگتے۔ تمام رات گزر گئی، لیکن چھلنی میں پانی نہیں بھرا۔ آخر کار جب مُرغے کی بانگ سُنائی دی تو وہ غُصّے کے عالم میں جھونپڑی میں واپس آئے اور چھلنی کو زمین پر پٹختے ہوئے بولے "چالاک لڑکی، اب تو ہم جا رہے ہیں۔ کل ذرا اِدھر آنا۔ پھر دیکھنا تمہارا کیا حال کرتے ہیں۔ ساری چالاکی دھری کی دھری رہ جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ماریا تھک چکی تھی ۔ آدھی رات تک وہ چرخا کاتتی رہی تھی۔ پھر ان لڑکوں سے پالا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور جلد ہی وہ گہری نیند سو گئی۔

اُدھر اس کی سوتیلی ماں صُبح ہی صُبح یہ سوچ کر گھر سے نکلی کہ لڑکی ضرور مری ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ ہمیشہ کے لیے اس

مصیبت سے چھٹکارا مل گیا لیکن جھونپڑی میں جا کر کیا دیکھتی ہے کہ مرنا تو رہا ایک طرف ماریا کا تو بال بھی بیکا نہ ہوا تھا۔ نہ صرف یہ ، بلکہ وہ تو بہترین کپڑے پہنے، قیمتی ہار، ٹوپی اور ایسی ہی بہت سی قیمتی چیزوں سے لدی پھندی آرام سے سو رہی تھی۔

اس نئے ماریا کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی تو سوتیلی ماں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اور جب ماریا نے ساری کہانی اُسے سنائی تو وہ بہت ہی حیران ہوئی۔

اب تو اُسے ماریا پر اور بھی غُصّہ آیا۔ وہ اس بات پر جل گئی تھی کہ ماریا کے پاس آریا سے بھی اچھے کپڑے اور عمدہ عمدہ چیزیں ہیں۔ فوراً گھر پہنچی اور آریا سے بولی ”بیٹی آج رات تم اُس جھونپڑی میں جاؤ اور ان لڑکوں سے اس سے بھی زیادہ قیمتی چیزیں مانگو۔ دیکھ لینا، وہ تم کو سر سے پاؤں تک سونے میں لاد دیں گے۔“

آریا نے اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ شام کو چرخا اور روئی لے کر

جھونپڑی میں پہنچی اور چرخا کاتنے لگی۔

سب کُچھ اسی طرح ہوا جیسے پچھلی رات کو ہوا تھا۔ آدھی رات کے قریب ایک گاڑی کی آواز آئی اور پھر وہی لڑکے، اسی طرح بغیر دروازہ کھولے کمرے میں داخل ہوئے۔

ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ساز بجنا شروع ہو گئے اور وہ تالیاں بجا بجا کر گانے لگے۔ انہیں کئے جائیں گے۔ کی کو لے جائیں گئے

ناچیں گے نچائیں گے

لڑکی کو لے جائیں گے

رات کا بدلہ چکائیں گے

لیکن آریا اتنی عقل مند یا چالاک نہ تھی جتنی ماریا۔ جب لڑکوں نے اس کی طرت ہاتھ بڑھا کر کہا "آؤ، ہمارے ساتھ ناچو" تو اس نے ساری چیزیں ایک ہی وقت میں مانگ لیں۔ اس نے کہا ناچنے کے لیے اچھے سے جوتے لا دو۔ ریشمی جرابیں، ریشمی ٹوپی، سنہری ہار اور سرخ ربن لا دو۔

اس کے ساتھ ہی اس نے پیسوں کی بھی فرمائش کر دی۔

لڑکے جب سب کُچھ لے آئے تو پھر اس نے انہیں پانی لانے کو کہا تا کہ ہاتھ دھو لے لیکن اس کی ماں نے اس کو چھلنی نہ دی تھی۔ اس نے سوچا کہ چھلنی کے متعلّق تو ان لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ اس میں پانی نہیں لیا جا سکتا۔ اس نے آریا کو ایک ایسی بالٹی دے دی تھی جس کے تلے میں سوراخ تھے۔

لڑکوں نے بالٹی ندی کے کنارے کیچڑ میں رکھ دی۔ پھر ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا "کل رات ہم پانی نہ لے جا سکے تھے۔ آج ایسا کرتے ہیں کہ بالٹی میں پہلے کُچھ ریت بھر لیتے ہیں تا کہ سُوراخ بند ہو جائیں۔"

بالٹی کے سوراخوں میں کیچڑ بھر گئی تھی۔ لڑکوں نے اس کے اندر ریت کی موٹی سی تہہ بھی بچھا دی۔ پھر بالٹی میں پانی بھرا اور اسے لے کر جھونپڑی میں پہنچے۔

آریا نے بہت سوچا لیکن اور کوئی بہانہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ لڑکے

چلائے "چالاک لڑکی، جلدی کر ہاتھ منہ دھو، کپڑے بدل اور ہمارے ساتھ ناچ۔"

آریا نے مُنھ دھویا، کپڑے بدلے اور پھر شیشہ دیکھنے لگی۔ لیکن لڑکوں نے اسے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا اور ناچنے لگے۔ وہ ایک دائرے میں اتنی تیزی سے چکّر لگا رہے تھے کہ آریا کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لیکن وہ لڑکے نہ رُکے اور اسی طرح ناچتے رہے۔ یہاں تک کہ اسے یوں لگا جیسے اُس کے بازو اور ٹانگیں جسم سے الگ ہو جائیں گی۔ وہ چلّائی۔

"خُدا کے لیے ذرا رُکو۔ مُجھے سانس لینے دو۔ چکّر آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھنے دو۔۔۔۔"

لیکن وہ بھلا رکنے والے کب تھے۔ وہ اور بھی تیزی سے ناچنے لگے، یہاں تک کہ مُرغے نے اذان دے دی۔ جب وہ رُکے تو آریا بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اُنہوں نے اس کا سر کاٹا اور پھر پیشانی میں کیل ٹھونک کر اُسے جھونپڑی کے باہر دروازے پر لٹکا دیا۔ پھر لاش اُٹھا کر ندی میں پھینک

دی اور غائب ہو گئے۔ یہ لڑکے اصل میں بھُوت تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی آدمی اس جھونپڑی میں آئے۔ اگر پہلی رات ماریا بھی ان کے ساتھ ناچنے لگتی تو وہ اس کا بھی یہی حال کرتے۔ لیکن اُس نے انہیں اس بات کا موقع ہی نہ دیا۔

آریا کی ماں صُبح کو خُوشی خُوشی اُٹھی اور اِس خیال سے جھونپڑی کی طرف چل دی کہ آریا نے ان لوگوں سے بہت قیمتی تحفے لیے ہوں گے۔

جب وہ اس موڑ پر پہنچی جہاں سے جھونپڑی کا دروازہ نظر آرہا تھا تو اسے یوں لگا جیسے آریا دروازے میں سے جھانک رہی ہو۔ اس نے زور سے کہا:

"آتی ہوں بیٹی، آتی ہوں۔ ذرا صبر کرو۔"

وہ جھونپڑی کے دروازے پر پہنچی تو یہ سمجھی کہ دیوار میں سوراخ ہے اور آریا نے سر باہر نکال رکھا ہے۔ وہ بولی "تم تو یوں مسکرا رہی ہو بیٹی جیسے دنیا جہان کی ساری دولت تمہیں مل گئی ہو۔ ذرا دکھاؤ تو سہی، کیا کیا چیز ملی ہے تمہیں۔"

اِس کے جواب میں آریا تو کیا بولتی، پاس کے درخت پر ایک پرندہ آکر بیٹھا اور این کی طرف منہ کر کے بولا:

"بے وقوف اور جاہل عورت۔ دیوار میں تو تیری بیٹی کا صِرف سر ہی ہے ۔اس کا دھڑ تو ندی میں بہہ گیا ہے۔"

اب تو این نے اپنا سر پیٹ لیا۔ یہ تباہی اس کی اپنی ہی لائی ہوئی تھی۔ اس نے سوتیلی بیٹی کے لیے جو کنواں کھودا تھا، اس کی اپنی بیٹی اس میں گر گئی تھی۔

ویران قلعہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک سرائے دار تھا۔ اس کی چھوٹی سی سرائے تھی۔ مسافر آتے، رات کو رہتے اور چلے جاتے۔ یُوں اُس کو کُچھ آمدنی ہو جاتی۔

سرائے دار کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام تھا سائمن تھا۔ یہ لڑکا بڑا ہوا تو بالکل بیکار اور نکھٹّو نِکلا۔ بس ہر وقت کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کیے رکھتا۔ اس کا باپ اس کے ہاتھوں بہت تنگ تھا۔

سائمن اپنے گاؤں سے باہر کبھی نہیں گیا تھا لیکن وہ پہاڑوں کی طرف دیکھتا تو کہتا کہ میں ایک دِن اِن پہاڑوں سے پرے جاؤں گا اور دنیا بھر کی سیر کروں گا۔ ندی کو دیکھتا تو کہتا کہ میں ایسی کئی ندیاں پار کر جاؤں گا۔ پھر سمندر پار جا کر ایسے ایسے کام کروں گا کہ کسی امیر آدمی کی لڑکی یا شہزادی میری بیوی بن کر فخر کرے گی اور یوں میری زندگی بہت اچھی

گزرے گی۔

لیکن یہ سب اُس کے خیالی پلاؤ تھے۔ وہ نہ صرف کوئی کام نہ کرتا تھا، بلکہ اپنے باپ کی دی ہوئی رقم بھی ضائع کر دیتا تھا۔ سرائے میں جو مسافر بھی آتا، سائمن کا باپ اس سے کہتا کہ اگر وہ سائمن کو سمجھائے کہ کُچھ کام دھندا کیا کرے۔ لیکن سائمن کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

آخر لوگوں نے سرائے دار کو مشورہ دیا کہ اس لڑکے کے لیے ایک ہی کام مناسب ہے۔ اسے فوج میں بھرتی کرادو۔ فوج والے اسے خود ہی ٹھیک کر لیں گے۔

سائمن کے باپ کو یہ مشورہ پسند آیا اور اُس نے بیٹے کو فوج میں بھرتی کرا دیا۔ لیکن فوج میں کافی عرصہ ملازمت کے بعد بھی اس نے کوئی ترقی نہ کی۔ اس پر اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ فوجی بینڈ میں شامل ہو جاؤں۔ اس نے افسروں کی منت سماجت کی اور فوجی بینڈ میں ڈھول بجانے پر لگ گیا۔

سائمن کے دوستوں میں ایک چالاک فوجی بھی تھا۔ وہ اس کی ڈینگوں

سے تنگ آچکا تھا۔ ایک دِن جب سائمن نے اس سے کہا کہ میرا باپ تو بہت امیر آدمی ہے۔ گھر پر مجھے اتنی عمدہ خوراک ملتی تھی، یہاں تو میں اکثر بھوکا رہ جاتا ہوں، تو اس کے دوست نے اس سے کہا کہ تم ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہو کہ تمہارا باپ امیر ہے، یہ ہے، وہ ہے۔ اگر وہ اتنا ہی امیر ہے تو اسے لکھو کہ مجھے ترقی دے کر داروغہ بنا دیا گیا ہے۔ اس خوشی میں مَیں اپنے افسروں کو پارٹی دوں گا۔ مہربانی کر کے کی رقم بھیج دیے۔ سائمن کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اس نے اسی وقت باپ کو خط لکھ دیا۔

سائمن کے والد کو یہ خط ملا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا اور کہا:

"دیکھ لو، باپ بیٹے کی قسمت آخر جاگ اُٹھی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور روپوں کی ایک تھیلی سائمن کو بھجوا دی۔

اِدھر سائمن کی وہی حالت تھی۔ خوب کھانا پینا اور عیش کرنا۔ دو تین مہینوں میں باپ کی طرف سے آئے ہوئے روپے فضول خرچی میں اُڑا

دیے اور پھر ایک اور خط باپ کو لکھ دیا کہ مجھے ترقی مل گئی ہے۔ میرے ساتھی افسر امیر گھرانوں کے ہیں اور بڑے ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ میری تنخواہ بہت تھوڑی ہے اور میں ان جیسے ٹھاٹھ باٹ نہیں بنا سکتا۔ مہربانی کر کے کُچھ اور روپے بھیجیے۔

باپ کو سائمن کا دوسرا خط ملا تو وہ اور بھی خوش ہوا کہ چلو لڑکا کسی قابل تو ہوا۔ اس نے پھر کُچھ رقم اس کو بھجوا دی۔ اب تو سائمن کی موج ہو گئی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے باپ کو ترقّی کی خبر سُناتا اور اس سے کُچھ نہ کُچھ رقم اینٹھ لیتا۔

کُچھ دِنوں بعد اس نے باپ کو لکھا کہ اب وہ ترقّی کرتے کرتے جرنیل بن گیا ہے۔ اس کا باپ یہ سن کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ وہ ہر آنے والے کو بڑے فخر سے بیٹے کی ترقّی کا حال سناتا۔

ایک دِن اس نے سوچا کہ اس کا بیٹا اتنا بڑا افسر ہو گیا ہے، کیوں نہ جا کر اس سے ملاقات کی جائے۔ اس میں اس کی اپنی بھی عزّت تھی اور

سائمن بھی خوش ہو جاتا۔

سائمن کے باپ نے اس خیال سے کہ بیٹا بہت بڑا آدمی ہے، ایک خوب صورت بگھّی کرائے پر لی۔ اس میں چار گھوڑے جُتے تھے۔ یوں دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے بڑی شان سے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

شہر میں ہر طرف بڑی رونق اور گہما گہمی تھی۔ فوج کی پریڈ ہو رہی تھی اور پیدل اور گھڑ سوار دستے بینڈ کی دھن پر پریڈ کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ سارا شہر پریڈ دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ فوجی دستوں کے آگے کھلی گاڑیاں تھیں جن میں کرنیل اور جرنیل بڑے رعب داب سے بیٹھے تھے۔

بوڑھے سرائے دار نے غور سے ایک ایک افسر کو دیکھا۔ اس کی بیوی نے بھی بہت کوشش کی لیکن کسی بھی گاڑی میں انھیں اپنا لائق بیٹا نظر نہ آیا۔ وہ سمجھے کہ شاید اُن کی نظر کو دھوکا ہوا ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے چند

لوگوں سے پُوچھا کہ کیا ان افسروں میں سائمن نام کا کوئی جرنیل بھی ہے؟

لوگ بوڑھے کی بات سن کر بڑے حیران ہوئے اُنھوں نے اسے بتایا کہ اس نام کا تو یہاں کوئی جرنیل نہیں۔ البتہ بینڈ والوں میں ایک ڈھول بجانے والا داروغہ ہے جس کا نام سائمن ہے۔

بوڑھے کو یہ سن کر سخت غصّہ آیا کہ اس کا بیٹا ابھی تک داروغہ ہے اور خطوں میں جھُوٹ مُوٹ اپنے کو جرنیل بتاتا ہے۔ وہ سیدھا فوج کے ایک افسر کے پاس گیا اور اسے ساری بات بتا کر کہا کہ اس کا لڑکا اس کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے سزا دے سکے۔

سائمن کی ماں گھر سے تو بڑے غصّے میں نِکلی تھی، لیکن اب جو اس نے اپنے شوہر کو غصّے میں یہ کہتے سُنا کہ وہ سائمن کو سزا دے گا تو اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس کو معاف کر دے، لیکن بوڑھے نے اس کی ایک نہ سُنی۔ اس نے سائمن کو رسّیوں میں جکڑا اور بگھّی کے پیچھے ڈال

کر چل دیا۔

سائمن کے جس دوست نے اسے باپ سے روپے منگوانے کا مشورہ دیا تھا وہ بھی یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے سائمن کی حالت پر بڑا رحم آیا اور وہ بگھّی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اِس علاقے کی سڑکیں ٹوٹی پھُوٹی اور کچّی تھیں، اس لیے بگھّی کی رفتار بہت سُست تھی۔ وہ تیز تیز بگھّی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جب ایک جگہ چڑھائی پر بگھّی بہت آہستہ ہو گئی تو اس نے سائمن کو بگھّی سے اُتار کر اُس کی رسّیاں کاٹ دیں اور اس سے کہا کہ اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ یہاں سے فوراً چلے جاؤ اور کہیں اور جا کر قسمت آزماؤ۔ تمہارے باپ کو تم پر اتنا غصّہ ہے کہ وہ تمہیں گولی مار دے گا۔ یہ کہہ کر اس کا دوست چلا گیا اور سائمن جنگل میں اکیلا رہ گیا۔

صبح کا وقت تھا سُورج نِکل رہا تھا۔ سائمن نے دُور اُفق کی طرف دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ مشرق کی طرف جائے گا۔

وہ چلتا گیا۔ کئی شہر، کئی گاؤں راستے میں آئے۔ تھک جاتا تو آرام کر لیتا۔ لوگ اُسے مسافر سمجھ کر کُچھ دے دیتے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بنسری تھی۔ وہ بنسری بڑی اچھی بجاتا تھا۔ جب دل گھبراتا تو بنسری بجانے لگتا۔

چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں اُسے دو قلعے نظر آئے۔ ایک قلعہ پہاڑی کے دامن میں تھا اور دوسرا پہاڑی کے اوپر۔ اوپر والا قلعہ بے آباد اور ویران سا تھا۔ سائمن نے لوگوں سے ان قلعوں کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑی کے دامن میں جو قلعہ ہے اس میں ایک شہزادہ اور اس کی پیاری سی بیٹی رہتی ہے۔ یہ شہزادی بہت ہی خوب صورت ہے، لیکن بہت اُداس رہتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت آنسو بہتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑی کی چوٹی والے قلعے میں ایک رُوح کا بسیرا ہے۔ یہ رُوح اس لڑکی کے دادا کی ہے جو چند سال پہلے فوت ہُوا تھا۔

شہزادی کا دادا زندگی بھر لوگوں پر ظلم کرتا رہا تھا۔ اس کے پاس بے شمار

دولت تھی، لیکن اس نے ساری دولت فضُول خرچیوں میں برباد کر دی۔ اس نے دنیا میں اتنے بڑے کام کیے تھے کہ مرنے کے بعد اس کی رُوح پر آسمان کے تمام راستے بند کر دیے گئے اور اسے اسی قلعے میں واپس آنا پڑا، جہاں وہ زندگی میں رہا کرتا تھا۔ جب شہزادی جوان ہوئی تو اس کی شادی کے لیے یہ شرط رکھی گئی کہ اس کے ساتھ وہی شخص شادی کر سکے گا جو اس قلعے میں سے اس روح کو نکالے گا۔

شہزادی اتنی خوب صورت تھی کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بہت سے شہزادے اور امیر زادے اس قلعے میں گئے تا کہ وہاں سے بوڑھے کی روح کو نکال سکیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ آیا۔ شہزادی کے اُداس اور غمگین رہنے کی یہی وجہ تھی۔

جب یہ بات سائمن نے سنی تو اس نے سوچا کہ میری زندگی تو ویسے بھی بے کار ہی ہے، کیوں نہ قلعے میں جا کر قسمت آزمائی کی جائے۔ مر گیا تو اس دکھ بھری زندگی سے نجات مل جائے گی۔ کامیابی ہُوئی تو عیش و آرام میں زندگی گُزر جائے گی۔ شہزادی بھی ملے گی اور اس کی دولت

بھی ہاتھ آئے گی۔

اگلے دِن صُبح کو وہ پہاڑ کے دامن والے قلعے کے دروازے کے پاس بیٹھ کر بانسری بجانے لگا۔ بانسری کی دھن اِتنی پیاری تھی کہ شہزادی اور اس کا باپ کھڑکی میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ شہزادی نے باپ سے ضِد کی کہ اس نوجوان کو قلعے ہی میں رکھ لیا جائے تا کہ جب وہ اُداس ہو تو اس کی بنسری سُن کر اپنا دِل بہلا لیا کرے۔

باپ اپنی بیٹی کی ہر بات مانتا تھا۔ اس نے خُوشی سے اِجازت دے دی۔ شہزادی خُود سائمن کے پاس گئی اور اسے یہ خوش خبری سنائی کہ آیندہ وہ قلعے میں رہا کرے گا۔

شہزادی اور اس کے والد نے سائمن کی آؤ بھگت کی اور نوکروں کو ہدایت کی کہ وہ اِس بات کا خیال رکھیں کہ شاہی مہمان کو اچھے سے اچھا کھانے کو ملے اور وہ ہر وقت خوش رہے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے پہاڑی قلعے کے متعلق سائمن کو بتایا تو اس نے فوراً سینہ ٹھونک کر کہا کہ

میں اس بوڑھے کی روح سے قلعے کو نجات دلاؤں گا۔ شہزادی کو سائمن
کی اس بات پر خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ خُوشی اس بات کی کہ اگر
وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو گیا تو دونوں ہنسی خُوشی زندگی گزاریں
گے۔ دکھ اس بات کا کہ شہزادی نہیں چاہتی تھی کہ سائمن رُوح کے
ہاتھوں مارا جائے۔

شہزادی کے والد نے جب دیکھا کہ سائمن کا ارادہ پکا ہے تو اس نے حکم
دیا کہ چار گھوڑوں والی بگھی منگوائی جائے اور سائمن کو رات ہونے سے
پہلے پہلے پہاڑی قلعے میں پہنچا دیا جائے۔

قلعے کے سامنے پہنچتے ہی سائمن کود کر بگھی سے باہر نِکلا۔ پھر قلعے کے
دروازے میں سے ہوتا ہوا ایک بہت بڑے کمرے میں پہنچ گیا۔ اندھیرا
ہونے والا تھا۔ اس نے میز پر پڑی ہوئی موم بتّی روشن کی اور کمرے کو
غور سے دیکھنے لگا۔

کمرے کی چھت پر بیل بُوٹے بنے ہوئے تھے اور ستونوں پر بھی عمدہ

نقش و نگار کھدے تھے۔ مدّت سے بند رہنے کی وجہ سے کمرے میں لگی ہوئی تصویروں اور ریشمی پردوں پر مٹّی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

اس نے ایک کھڑکی کھولی تو باہر سے ایک باغ نظر آیا۔ لیکن وہ اُجڑ چکا

تھا۔ گھاس خشک ہو گئی تھی اور بیلیں سُوکھ گئی تھیں۔ ہر طرف بھیانک خاموشی طاری تھی۔

سائمن نے ایک الماری کھولی تو اس میں سے ایک گھڑی ملی۔ اس نے گھڑی میں چابی دی اور اندازے سے وقت ٹھیک کیا تاکہ وقت کا پتا چل سکے۔

پھر اس نے الماری سے ایک پُرانا ناول نکالا اور کُرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا ۔اس کے دِل میں کسی قسم کا ڈر یا خوف نہ تھا۔

پڑھتے پڑھتے گیارہ بج گئے۔ پھر ساڑھے گیارہ۔ وہ اُکتا گیا تو سوچنے لگا کہ آدھی رات ہونے کو آئی، خُدا جانے روح کب آئے گی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اچانک کسی گاڑی کی آواز آئی۔ یہ آواز بہت دُور سے آ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ نزدیک ہوتی گئی۔ سائمن کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لیکن وہ اسی طرح پڑھنے میں مصروف رہا۔

کُچھ دیر بعد دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک بوڑھا آدمی چابیوں کا گچھا ہاتھ

میں لیے اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا اور اس کا رنگ ایسا سیاہ تھا جیسے توا۔ آنکھیں ایسے نظر آ رہی تھیں جیسے اُن میں کوئلے دہک رہے ہوں۔

سائمن بالکل نہ ڈرا، نہ اس نے کوئی حرکت کی۔ اُسی طرح کتاب پڑھتا رہا ۔۔۔۔ بُوڑھا گھُورتا ہوا اس کے پاس آیا اور رعب دار آواز میں بولا:

"اے! تم یہاں کِس کی اجازت سے آئے ہو؟"

سائمن بولا "مسافر ہوں۔ راستے میں شام ہو گئی۔ قلعہ دیکھا تو اندر چلا آیا ۔۔۔۔"

بوڑھا گرج کر بولا "تمہیں ڈر نہیں لگا؟ کسی نے نہیں بتایا تمہیں کہ یہاں کئی بہادر نوجوان اپنی جان کھو چکے ہیں؟ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ سمجھے؟"

سائمن اطمینان سے بولا "میں ایک غریب مزدُور کا بیٹا ہوں۔ موت کی کم ہی پروا کرتا ہوں۔"

بوڑھا بولا "بڑے شیخی خورے معلوم ہوتے ہو۔ دیکھوں گا کب تک شیخی بگھارو گے۔ یہ لو چابیاں اور ایک ایک کر کے قلعے کے دروازے کھولتے جاؤ۔"

سائمن وہیں بیٹھا بیٹھا بولا "میں کوئی تمہارا ملازم ہوں؟ تم خود ہی کھولو نا۔ البتّہ میں تمہارے پیچھے پیچھے آ سکتا ہوں۔"

بُوڑھے کی روح نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ چابیاں لے کر چل پڑا۔ سائمن اس کے پیچھے چل دیا۔ بوڑھا ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سائمن نے دیکھا کہ بوڑھے کے سر کے بال ایک دم سفید ہو گئے ہیں۔

بوڑھے نے دوسرا دروازہ کھولا اور پھر تیسرے دروازے پر رک کر ایک بار پھر سائمن سے کہا کہ چابیاں لے کر دروازہ کھولو۔ سائمن نے انکار کیا تو اس نے خود ہی تیسرا دروازہ بھی کھول دیا۔ سائمن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سر کے بالوں کے علاوہ پورے کا آدھا جسم بھی سفید ہو گیا ہے۔

وہ یہ سب کُچھ دیکھتا رہا، لیکن خاموش رہا۔ جوں جوں بوڑھا دروازے

کھولتا گیا، اس کا جسم سفید ہوتا گیا۔ ساتواں دروازہ کھولنے پر وہ گھٹنوں تک سفید ہُوا اور جب بارہ کے بارہ دروازے کھل گئے تو وہ پورے کا پورا سفید ہو گیا۔

بارھویں کمرے میں انسانی ہڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ اُن بہادر لوگوں کی ہڈّیاں تھیں جنہیں اس روح نے مار ڈالا تھا۔ بوڑھے نے آہستہ سے کہا "دیکھو، یہاں کتنے نوجوان اپنی جان کھو چکے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہ تھا کہ یہاں کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ میں بہت عرصے سے ایک مزدُور ہی کے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے اپنے آپ کو بھی بچا لیا، مجھے بھی اس قید سے آزاد کر دیا اور قلعے کو بھی تباہی سے بچا لیا۔ اب یوں کرو کہ یہ کلہاڑی اُٹھا کر میرا سر کاٹ دو۔"

سائمن بہت بہادر تھا، لیکن یہ بات سن کر گھبرا گیا اور ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

بوڑھا پھر بولا "دیکھو اگر تم نے میرا سر نہ کاٹا تو تمہاری ساری محنت بے کار

جائے گی۔ میری ورح یہیں اسی قلعے میں رہے گی اور تمہیں اپنی سر کی قربانی دینی پڑے گی۔"

اب سائمن مجبور ہو گیا۔ اس نے کلہاڑی اُٹھائی اور گھما کر بوڑھے کی گردن پر دے ماری۔ گردن ایک جھٹکے کے ساتھ جسم سے الگ ہو کر سائمن کے پیروں میں گری۔ اگلے ہی لمحے وہاں گردن کے بجائے مٹی کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس ڈھیر میں سے ایک سفید کبوتر نکل کر کھڑکی سے باہر اُڑ گیا۔ یہی شہزادی کے دادا کی روح تھی۔

سائمن بہت تھک چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ لیٹ گیا اور گہری نیند سو گیا۔

صُبح اُس کی آنکھ اس وقت کھلی جب شہزادی اور اس کے والد کی بگھّی کی آواز آئی۔ وہ بھاگ کر باہر نِکلا تو شہزادی اور اس کا والد بڑے غور سے اُسے دیکھنے لگے۔ آج تک اس قلعے سے کوئی زندہ واپس نہ نِکلا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

جب سائمن نے انہیں بتایا کہ بوڑھے کی روح قلعے سے جا چکی ہے تو وہ کود کر بگھی سے اُترے۔ سائمن اُنہیں لے کر قلعے میں داخل ہوا اور تمام کمرے دکھائے۔ اَب انہیں یقین آیا۔

شہزادی سائمن کی کام یابی پر بہت خوش تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ جہاں بے شمار شہزادے اور بہادر نوجوان ناکام ہو چکے تھے، وہاں سائمن نے یہ مُہم سر کر لی تھی۔

سب سے پہلے شہزادی کے والد نے حکم دیا کہ ان تمام نوجوانوں کی ہڈیوں کو، جو روح کے ہاتھوں مارے گئے تھے، عزّت کے ساتھ دفن کیا جائے۔ پھر اس نے قلعے کی صفائی کرا کے رنگ و روغن کروایا۔ اس کے بعد سائمن اور شہزادی کی شادی کا جشن منانے کا حکم دیا لیکن سائمن نے کہا:

"بہت عرصہ ہو گیا میں اپنے والدین سے نہیں مِلا۔ میں نے ان کو بہت تکلیفیں دی ہیں۔ میں اِس خوشی میں اُن کو ضرور شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

شہزادی کا والد راضی ہو گیا۔ اس نے بجائے شادی کے سائمن اور شہزادی کی منگنی دھوم دھام سے کر دی۔ پھر سائمن کے سفر کی تیاری کی گئی۔

سائمن کے جانے پر شہزادی بہت اُداس ہوئی۔ اس نے سائمن سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے والدین سے مل کر جلد واپس آئے گا۔ شہزادی نے سائمن سے اُس کے گھر کا پتا بھی لیا تاکہ اگر وہ واپس نہ آئے تو وہ خُود اس کے گھر پہنچ جائے۔

سائمن بہت سے نوکروں اور درباریوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ خوش تھا کہ اب بڑا آدمی بن کر اپنے ماں باپ کے پاس جا رہا ہے۔ موسم خوش گوار تھا۔ قافلہ نو دِن تو خیر و خوبی چلتا رہا لیکن دسویں دِن اُسے ایک گھنے جنگل میں سے گزرنا پڑا۔

جب وہ جنگل میں داخل ہوئے تو چاند نِکلا ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھا گئے۔ اندھیرا ہو گیا اور بارش شروع ہو گئی۔ جنگل میں دُور دُور

تک کوئی ایسی محفوظ جگہ نہ تھی جہاں یہ لوگ پناہ لیتے۔ ایک تو اندھیرا، دوسرے سخت بارش۔ راستہ تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ بھوکے پیاسے، تھکے ہارے آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ لیکن جنگل ختم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اچانک درباریوں میں سے کسی کو دُور ایک ٹمٹاتی ہوئی روشنی نظر آئی جو درختوں میں سے چھِن چھِن کر آرہی تھی۔ وہ اسی طرت چل دیے۔

یہ روشنی ایک سرائے میں سے آرہی تھی۔ یہ لوگ اندر داخل ہوئے تو ایک بوڑھی عورت کو چُولھے پر کھانا پکاتے ہوئے پایا۔ اتنے میں سرائے والا بھی آ گیا۔ وہ لوگ اندر تو چلے گئے لیکن انہیں سرائے دار کی آنکھوں سے شرارت ٹپکتی نظر آرہی تھی۔

وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ سرائے دار اسی موقعے کے انتظار میں تھا۔ دراصل یہ سرائے مسافروں کو لوٹنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہاں مسافروں کو لوٹ کر انہیں موت کی نیند سلا دیا جاتا

تھا۔

جب یہ لوگ سو گئے تو سرائے والا آہستہ سے نِکل کر جنگل میں اپنے ساتھیوں کے پاس گیا۔ یہ لوگ تعداد میں بارہ اور نہایت ظالم قسم کے ڈاکو تھے۔ سرائے والا ان کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے پُوچھا:

"کیا خبر لائے ہو؟"

سرائے والا بولا "بہت بڑی خوش خبری ہے۔ ایک بہت بڑا نواب اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرائے میں آ کر ٹھہرا ہے۔ ان کے پاس گھوڑے، ہیرے، جواہرات ریشمی کپڑا اور بہت سا قیمتی سامان ہے۔"

ڈاکوؤں نے کہا "ان کی تعداد کتنی ہے؟"

"تعداد تو بہت ہے، لیکن وہ لوگ اس قدر تھکے ہوئے ہیں کہ انھیں سر پیر کا ہوش نہیں۔ یہی موقع ہے اُن کے گلے کاٹنے کا۔"

ڈاکو دبے پاؤں سرائے میں داخل ہوئے اور سائمن کے ساتھیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ جب سائمن کو اپنے ساتھیوں کی چیخیں سنائی دیں تو وہ

ہڑبڑا کر اُٹھا اور ساتھیوں سے پستول مانگا۔ لیکن ڈاکو زیادہ تیز تھے۔ اُن کے سردار نے سائمن پر پستول کی گولی داغ دی اور وہ خون میں لت پت ہو کر گر پڑا۔ ڈاکوؤں نے سائمن کو مردہ سمجھ کر پہلے اس کے گلے کا ہار اور انگوٹھی اُتاری پھر سارا سامان اُٹھایا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیے۔

سائمن زخمی ہو گیا تھا لیکن مرا نہیں تھا۔ اس کے ساتھیوں میں کوئی بھی زندہ نہ بچا تھا۔ ڈاکو چلے گئے تو اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور چپکے سے سرائے میں سے نکل کر جنگل کا راستہ لیا۔

وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ یہاں تک کہ سُورج ڈوبنے سے پہلے جنگل میں سے نِکل گیا۔ اب وہ اپنے باپ کی سرائے سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے پاؤں ننگے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سفر کی تھکاوٹ اور ڈاکوؤں کے حملے سے اس کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ وہ ایسی حالت میں اپنے باپ کے سامنے جانا نہ چاہتا تھا۔ وہیں بیٹھ کر رات کا انتظار کرنے لگا۔

یہاں چند گڈریوں نے اُسے پہچان لیا اور اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بولے:

"ارے سائمن! تم تو فوج میں جرنیل ہو گئے تھے۔ جرنیل صاحب ننگے پاؤں کہاں سے بھاگ کر آ رہے ہو؟"

سائمن بولا "میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں اب وہ بھُوکا ننگا سائمن نہیں ہوں۔ اب میں بہت امیر اور ایک شہزادے کا داماد ہوں۔ البتہ مجھ پر ایک مصیبت آن پڑی ہے۔ میرے تمام ساتھیوں کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا اور سارا سامان چھین کر لے گئے۔ دیکھ لو، میرے کپڑے کتنے قیمتی ہیں لیکن پھٹے ہوئے ہیں۔"

گڈریوں نے سائمن کو اپنے کپڑے دیے اور اپنے ساتھ گاؤں لے گئے۔ سائمن کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماں اسے دیکھ کر بھاگی ہوئی آئی اور اسے چمٹا کر رونے لگی۔ بُرے حال میں سہی، لیکن اس کا بیٹا زندہ تو تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی لیکن شوہر کے غصّے کے ڈر سے اس نے سائمن کو ایک

کمرے میں بند کر دیا۔

سائمن کا باپ واپس آیا تو اس نے محسوس کیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے پُوچھا "کیا بات ہے، روتی کیوں ہو؟"

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں" بُڑھیا بولی "ہمارا سائمن زندہ ہے۔"

"کس بے وقوت کا نام لے رہی ہو۔" بوڑھا بولا "اگر مجھے پتا چل جائے کہ وہ کہاں ہے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

لیکن جب اس نے دیکھا کہ بُڑھیا کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے ہیں تو وہ نرم پڑ گیا اور بیوی سے پُوچھا:

"کہاں چھپایا ہے تم نے سائمن کو؟" بُڑھیا نے اُسے قسم دی کہ وہ سائمن کو کُچھ نہیں کہے گا اور پھر سائمن کر آواز دی۔

بوڑھے نے سائمن کو پرانے کپڑے پہننے کو دیئے اور اپنی اور گاؤں والوں کی بکریاں چرانے پر لگا دیا۔ سائمن بنسری ساتھ لے جاتا۔

بکریاں چرتی رہیں اور وہ بنسری بجاتا رہتا۔ اسے یقین تھا کہ شہزادی ضرور اسے تلاش کرہوئی آئے گی۔

جب سائمن کو گھر گئے تین ہفتے ہو گئے اور وہ واپس نہ آیا تو شہزادی کو بہت فکر ہوئی اور وہ باپ سے اجازت لے کر اسے ڈھونڈنے نِکل کھڑی ہوئی۔ باپ نے اس کے ساتھ بہت سے سپاہی کر دیے تھے۔

شہزادی بھی اُسی راستے سے ہوتی ہوئی اُسی سرائے میں پہنچ گئی جہاں سائمن ٹھہرا تھا۔ اتفاق سے سرائے والا اس وقت موجود نہ تھا۔ وہی بُڑھیا جو سائمن کو کھانا پکاتی ہوئی نظر آئی تھی، شہزادی کے پاس آکر بولی:

"بیٹی تم یہاں نہ ٹھہرو۔ یہ ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے۔ وہ ظالم مسافروں کو لوٹ کر ان کا گلا کاٹ دیتے تھے۔ ابھی تین ہفتوں کی بات ہے، ایک امیر آدمی یہاں اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ ڈاکوؤں نے ان کا سامان چھین کر ان سب کو مار ڈالا؟۔"

شہزادی کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔ لیکن جب بُڑھیا نے اسے بتایا کہ اور سب لوگ تو مارے گئے تھے لیکن ان کا سردار زخمی ہونے کے باوجود بچ نِکلا تھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

شہزادی بہت بہادر تھی۔ وہ ان ڈاکوؤں سے بالکل نہ گھبرائی بلکہ سائمن کی تکلیف کا سن کر تو اس کا اور بھی دل چاہا کہ ان کو خوب مزا چکھائے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ہتھیار تیار رکھیں اور آنکھیں بند کر لیں لیکن سوئیں نہیں۔

سرائے والا واپس آیا تو شہزادی کا سامان دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ بھاگا بھاگا ڈاکوؤں کے پاس گیا اور انہیں بلا لایا۔ شہزادی اور اس کے ساتھیوں کو گہری نیند سوتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس بار بات اُلٹی ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ سوتے ہوئے مسافر اچانک حملے سے حیران ہوتے، ان کے ایک دم اُٹھ کر حملہ کرنے سے ڈاکو حیران رہ گئے۔ یہ ان کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ اُن کے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

شہزادی کے ساتھیوں نے ڈاکوؤں کو ایک ایک کر کے مارنا شروع کر دیا۔ خُود شہزادی نے ان کے سر دار کے سینے میں گولی مار دی۔ اور جب بارہ کے بارہ ڈاکو اور سرائے کا دھوکے باز مالک مارے گئے تو شہزادی نے بُڑھیا کو ساتھ لیا اور سائمن کی تلاش میں چل نِکلی۔

آخر کار وہ اِس علاقے میں جا پہنچی جہاں سائمن بکریاں چرا رہا تھا۔ شہزادی کو بانسری کی آواز آئی تو اُس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ سائمن کی بانسری ہے۔

اس نے ساتھیوں کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود گھوڑے سے اُتر چھپتی چھپاتی سائمن کے قریب پہنچ گئی۔ یہ سچ مچ سائمن ہی تھا۔ شہزادی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور فوراً ہی واپس آگئی۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سائمن کے باپ کی سرائے کی طرف چل دی۔

بوڑھا سرائے دار شہزادی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوا

اور جب شہزادی نے اس کی سرائے میں ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ گھبرا گیا اور بولا کہ وہ غریب آدمی ہے۔ اس کی سرائے شہزادی کے لائق نہیں ہے۔

لیکن شہزادی نے نہ صرف وہاں ٹھہرنے پر ضد کی، بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ کِسی اور ملازم کے بجائے وہ اپنے لڑکے کو اس کی خدمت پر لگائے۔ بوڑھے نے شہزادی سے کہا کہ اس کا لڑکا بہت نالائق، بے وقوف اور بدتمیز ہے۔ آپ کی خدمت کرنے کے قابل نہیں لیکن شہزادی نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ ناچار بوڑھے نے سائمن کو شہزادی کے دروازے کے باہر بٹھادیا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی نے پانی مانگا۔ سائمن نے پانی کا گلاس لیا اور نظریں نیچی کر کے اندر چلا گیا۔ شہزادی نے پانی پیا اور جب دیکھا کہ سائمن نظریں اوپر نہیں اُٹھاتا تو گلاس زمین پر پھینک دیا۔ سائمن فرش پر سے گلاس کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگا۔ شہزادی بھاگ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ سائمن نے شہزادی کو دیکھا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

شہزادی سائمن کے لیے بُہت عُمدہ کپڑے لے کر گئی تھی ۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر دونوں زرق برق لباس میں سائمن کے والدین سے ملنے گئے۔

بوڑھا سائمن کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ شہزادی بولی ”ابّا جان، آپ اپنے بیٹے کو نہیں پہچانتے۔“

بوڑھا ہکا بکا ہو کر بولا: ”یہ شہزادہ ہے تو میرے لڑکے جیسا ہی، لیکن میرا لڑکا تو شہزادہ نہیں ہے۔“

بوڑھا کبھی شہزادی کو دیکھتا کبھی سائمن کو۔ اس کی سمجھ میں کُچھ نہ آ رہا تھا۔ آخر کار سائمن جھُکا اور اپنے باپ کے پیروں کو چھوتے ہوئے بولا ” ابا جان! میں آپ سے اپنی غلطیوں کی معافی چاہتا ہوں۔“

اور پھر جب اس نے اور شہزادی نے قلعے والی بات ، منگنی کی بات اور ڈاکوؤں والا واقعہ سنایا تو بوڑھا اور بُڑھیا بہت ہی خوش ہُوئے ۔ یہ سب باتیں ہو چکیں تو شہزادی سائمن اور اس کے ماں باپ کو لے کر واپس چلی

گئی۔ سائمن اور شہزادی کی شادی دھوم دھام سے ہوئی اور وہ دونوں پہاڑی والے قلعے میں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

شادی کے بعد سائمن کے بوڑھے والدین اپنی سرائے میں واپس آ گئے، کیوں کہ وہ سرائے کو چھوڑنے کو تیّار نہ تھے۔ لیکن اب انہیں کوئی دُکھ، تکلیف یا پریشانی نہ تھی۔

میتھیو کی قبر

بہت پرانے زمانے کی بات ہے، ایک سوداگر کسی ملک سے واپس آ رہا تھا۔ اسے گھر سے گئے لمبا عرصہ گُزر چُکا تھا اور وہ جلد سے جلد واپس گھر پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ جس چھکڑے پر وہ سفر کر رہا تھا، وہ تجارتی سامان سے لدا ہُوا تھا۔

سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی تھی اور گھوڑے چھکڑے کو بڑی مشکل سے کھینچ رہے تھے۔ یہ راستہ ایک جنگل میں سے گزرتا تھا۔ سوداگر کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے وہ بے جھجک جنگل میں داخل ہو گیا۔

اندھیری رات تھی۔ نہ چاند، نہ ستارے۔ اُوپر سے بارش شروع ہو گئی۔ ایک تو اندھیرا دوسرے کیچڑ۔ گھوڑے بڑی مشکل سے ایک جگہ سے چھکڑا کھینچ کر نکالتے تو وہ تھوڑی ہی دُور جا کر دوسری جگہ پھنس جاتا۔ بجلی کڑک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے کہ اچانک چھکڑا ایک گڑھے میں

پھنس گیا۔ پہیے آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوب گئے تھے اور ان کے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

سامان قیمتی تھا۔ سوداگر اُسے چھوڑنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اس نے یہ کیا کہ گھوڑوں کو کھولا، جو سامان ان پر لادا جا سکتا تھا، لاد دیا، جو خود اُٹھا سکتا تھا وہ اپنی پیٹھ پر اُٹھالیا اور آگے چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ اپنے آپ سے کہنے لگا:

"میں بھی تھکا ہوا ہوں، گھوڑے بھی تھک چکے ہیں۔ آخر ہم اس کالی رات میں کہاں تک چلیں گے۔ اور آخر کوئی جنگل جانور ہمیں کھا گیا تو کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ اگر کوئی جن بھوت، شیطان یا انسان مجھے اس خوف ناک جنگل سے باہر نکال دے تو میں اپنا آدھا سامان اسے دے دوں گا۔"

جوں ہی یہ بات اُس کے مُنھ سے نکلی، بادل زور سے گرجا، بجلی زور سے کڑکی اور پھر بادل کے پیچھے سے چاند نِکل آیا۔ چاند کی روشنی میں سوداگر نے دیکھا کہ راستے کے ایک طرف ایک چھوٹی سی عجیب و غریب مخلوق

کھڑی ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے قدر کا اِنسان تھا، جس کے سر پہ لمبوتری ٹوپی تھی۔ پاؤں میں ایسے جوتے تھے جن میں سے اُس کے نوکیلے پاؤں باہر نکلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس کا چہرہ خوف ناک تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور ہاتھ ایسے تھے جیسے شیر کے پنجے ہوں۔

اب تو سوداگر بہت گھبرایا۔ اس کا دِل ڈوبنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ ضرور کوئی جن یا بھوت ہے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ چھلاوا آگے آیا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا:

"تمہاری خواہش کے مطابق میں تمہیں جنگل سے نکال کر گھر کے راستے پر ڈال سکتا ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط۔۔۔" سوداگر گھبرا کر بولا۔

چھلاوا بولا "تمہیں وعدہ کرنا ہو گا کہ اگر تم گھر پہنچ کر وہاں کوئی ایسی چیز دیکھو جو اس سے پہلے تمہارے گھر میں نہیں تھی اور جس کا تمہیں اس وقت پتا نہیں ہے، تو وہ میری ہو جائے گی اور میں جب چاہوں اسے تم

سے لے لوں گا۔“

سوداگر نے بہت غور کیا، خوب خوب سوچا لیکن اُس کے ذہن میں ایسی کوئی چیز نہ آئی جو اس کی غیر حاضری میں گھر میں آ سکتی ہو۔

وہ بولا:

”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔“

یہ بات سُنتے ہی چھلاوے نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر شرطیں لکھی ہوئی تھیں۔ پھر اُس نے سوداگر کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں اپنا ناخن مارا۔ خُون نِکلا تو اس نے اُس میں پَر ڈبویا اور سوداگر کو کاغذ پر دستخط کرنے کو کہا:

اس کام سے فارغ ہو کر چھلاوے نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز جنگل میں گونجتے ہی ہر طرف اسی کی شکل کے چھلاوے نظر آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُنھوں نے سوداگر کا تمام سامان، چھکڑا، گھوڑے جنگل کے پار صاف ستھرے راستے پر پہنچا دیے۔ اس کے بعد وہ سب غائب ہو گئے۔

ان کے غائب ہوتے ہی جنگل میں جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے بہت سے لوگ قہقہے لگا رہے ہوں۔

سوداگر نے اِس علاقے سے نکلنے میں ہی خیریت سمجھی اور چھکڑے کو تیز تیز ہانکتا ہُوا بہت دُور نِکل گیا۔ یہاں اس نے ایک کھُلے میدان میں ڈیرا ڈال دیا تاکہ آرام کر سکے۔ صُبح اٹھا تو موسم صاف تھا۔ دھوپ نِکلی ہوئی تھی۔ وہ گھر کی طرف چل دیا۔

چند دِن کے سفر کے بعد، جس میں اور کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا، سوداگر اپنے شہر کراکو کے باہر پہنچ گیا۔ جب وہ گھر کے پاس پہنچا تو اس کی بیوی بھاگی ہوئی آئی اور اپنے شوہر کو بچے کی پیدائش کی مبارک دی جو اس کی غیر حاضری میں پیدا ہوا تھا۔ سوداگر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور بچے کو سینے سے لگا لیا۔

اَب جو اُس نے بیوی کو سفر کے حالات سنائے اور اُسے اُس مُعاہدے کا خیال آیا جو وہ جنگل میں چھلاوے سے کر آیا تھا تو اس پر بجلی گر پڑی اور

اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ ان جانے میں اپنے معصوم بچے کا سودا کر بیٹھا ہے۔ جب اُس کی بیوی نے یہ سُنا کہ اس بچے کو چھلاوا لے جائے گا تو اسے اتنا غم ہوا کہ اس نے اپنے بال نوچ ڈالے۔

وقت گزرتا گیا۔ اس دُوران میں اور تو کُچھ نہ ہو البتہ جب کبھی وہ بچے کو گھمانے پھرانے کے لیے باہر جانے کا ارادہ کرتے تو ایک دم بادل گھِر آتے، بارش ہونے لگتی، بجلی کڑکنے لگتی اور وہ گھبرا کر بچّے کو واپس گھر لے آتے۔

بچہ بہت خوب صورت اور صحت مند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ذہین بھی تھا اور سکول میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ اسے دیکھ کر کِسی کو یقین نہ آتا تھا کہ اس پر کِسی چھلاوے کا سایہ ہے۔ماں باپ نے اس کا نام نکولس رکھا تھا۔

جب نکولس جوان ہوا تو اُسے اِحساس ہوا کہ ماں باپ ہر وقت چُپ چُپ سے رہتے ہیں۔ ہنسنا تو بڑی بات ہے، کبھی مُسکراتے بھی نہیں۔ آخر اس نے ایک دِن اپنے باپ سے پُوچھا:

”ابّا جان، میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو اور امّی کو کبھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا۔ کیا بات ہے؟ آپ ہنستے کیوں نہیں؟ آخر آپ کو کیا غم ہے؟“

باپ بیٹے کو کُچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے ہوں ہاں کر کے اُسے ٹالنا چاہا تو وہ بولا:

”جب کبھی میں جنگل کی طرف نِکل جاتا ہوں تو یُوں لگتا ہے جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ کبھی آگے سے گزرتا ہے کبھی پیچھے سے۔ کبھی درختوں سے آواز آتی ہے، نکولس، تمہارا پڑھنا لکھنا سب بے کار ہے تمہیں تو آخر کار وہی کُچھ کرنا ہے جو میں تمہیں سکھاؤں گا۔“

یہ سُن کر اس کا باپ رونے لگا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو بولا ”بیٹے میں ہی وہ بدلصیب ہوں جس نے تمہاری زندگی کے راستوں میں کانٹے بو دیے ہیں۔ تم ابھی بچّے ہی تھے کہ میں نے اَن جانے میں تمہارا سودا ایک چھلاوے سے کر لیا تھا۔“

یہ کہہ کر اس نے اُس رات والا تمام قصّہ اُسے کہہ سُنایا۔ اس کے بعد پھر رونے لگا۔

بیٹے سے باپ کا رونا دیکھا نہ گیا۔ وہ بولا:

"ابّا جان آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ میں نے جنگلوں میں گھوم پھر کر بہت کُچھ سیکھ لیا ہے۔ میں اس چھلاوے سے وہ کاغذ جس پر آپ نے اپنے خون سے دستخط کیے تھے، چھین کر لے آؤں گا۔ آپ اور امُی اپنا دِل میلا نہ کریں۔ خُوش رہیں۔"

نکولس نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا اور اپنے والدین کو خدا حافظ کہہ کے گاؤں سے چلا گیا۔ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اُسے ایک ایسا بوڑھا مِلا جس کے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے اور چہرے پر جھُریاں پڑی ہوئی تھیں۔

نکولس نے سلام کیا تو بوڑھے نے پُوچھا:

"اچھّے بیٹے، کِدھر کا اِرادہ ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟"

نکولس بولا "میں اُس چھلاوے کی تلاش میں نِکلا ہوں جِس نے میرے باپ کو دھوکا دے کر اور اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اُس سے ایک کاغذ پر دستخط کروا لئے تھے۔"

"تو ایسا کرو۔۔۔" بوڑھا بولا۔ "اسی راستے پر چلتے جاؤ۔ جب سُورج چھپ جائے تو سب سے پہلی جو جان دار چیز نظر آئے، اُسی کے پیچھے پیچھے چل دینا۔ تمہارے من کی مُراد پوری ہو گی۔"

نکولس اسی راستے پر چلتا گیا۔ جب شام ہوئی اور سُورج ڈوبنے لگا تو بڑا پریشان ہوا کہ اب کِدھر کو جائے؟ ابھی تھوڑا سا اُجالا باقی تھا کہ ایک بھورے رنگ کی چھوٹی سی چوہیا اچانک کہیں سے نکلی اور نکولس کے آگے آگئے بھاگنے لگی۔ نکولس کو بوڑھے کی بات یاد آگئی۔ وہ چوہیا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جب بالکل اندھیرا ہو گیا تو نکولس نے سوچا کہ اب آرام کرنا چاہیے۔ وہ ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس نے دیکھا کہ کُچھ

فاصلے پر چوہیا بھی رُک گئی ہے۔

رات کو پہلو بدلتے ہوئے نکولس کی آنکھ کھلتی تو اسے دو موتی سے چمکتے نظر آتے۔ یہ چوہیا کی آنکھیں تھیں جو لگاتار نکولس کر گھور رہی تھیں۔

صُبح کو وہ چل دیتے اور شام کو رُک جاتے۔ نکولس روٹی کھاتا تو اس کے ریزے زمین پر ِگر جاتے۔ وہ چوہیا کھا لیتی۔ وہ کبھی کبھی آنکھوں سے اُوجھل بھی ہو جاتی۔ لیکن جب بھی نکولس راستہ بھول جاتا اور سوچنے لگتا کہ اب کِس طرف جانا ہے تو چوہیا فوراً بھاگتی ہوئی آ جاتی۔

اب راستہ اُونچا ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف اونچی نیچی پہاڑیاں، ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ سبزے کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ بڑی خوف ناک جگہ تھی۔ چرند، پرند، اِنسان کوئی بھی جاندار نظر نہ آتا تھا۔ نیچے لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ اُوپر پہنچو تو میتھیو کے غار سے بچ کے رہنا۔ اس کے دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا تھا کہ میتھیو ایک بدمعاش ہے اور اس پہاڑی پر رہتا ہے اور لوگوں کو جان سے مار ڈالتا ہے۔ چوہیا نکولس کو راستہ

دکھارہی تھی اور نکولس تھک ہار کر آرام کرنے کی سوچ رہا تھا کہ دُور ایک ٹمٹاتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ وہ اُسی سمت چل دیا۔ یہ راستہ چٹانوں کے اندر ایک غار تک جاتا تھا۔ غار کے باہر دروازہ تھا۔

نکولس نے دروازے پر دستک دی۔ کافی دیر بعد ایک بُڑھیا باہر نکلی، جس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ نکولس نے جھانک کر اندر دیکھا تو اسے لکڑیاں جلتی ہوئی نظر آئیں۔

نکولس نے بُڑھیا کو سلام کیا تو وہ بولی:

"لڑکے یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ، ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ میرا ظالم بیٹا میتھیو واپس آنے والا ہے۔ وہ اپنے کوڑے سے تمہاری چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دے گا۔ تم ابھی نوجوان ہو اور اچھے گھرانے کے نظر آتے ہو۔ جاؤ، جلدی کرو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"اچھی امّاں" نکولس بولا "میں اِتنا تھکا ہوا ہوں کہ ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ آپ مجھے یہاں رات گزارنے کی اجازت دے دیں۔ آگے جو میری قسمت۔"

بُڑھیا نے نکولس کو لکڑیوں کے ڈھیر کے نیچے چھُپا دیا۔ آدھی رات کے قریب میتھیو واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سیب کے درخت کا کوڑا تھا۔

غار کے اندر داخل ہوتے ہی اُس نے ناک اُوپر کر کے ہوا میں کُچھ سونگھا اور پھر زور سے گرج کر بولا:

”بُڑھیا! مجھے انسانی جسم کی بُو آ رہی ہے۔ بتا، کہاں چھپا رکھا ہے تُو نے اُس کو؟“

بُڑھیا نے بہت کوشش کی لیکن میتھیو کو ٹال نہ سکی اور جب میتھیو نے خُود ہی تلاش کرنا شروع کر دیا تو بُڑھیا نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کو سب کُچھ بتا دے۔ اس نے میتھیو کو بتایا کہ کِس طرح ایک نوجوان لڑکا آیا تھا اور اس نے اُسے پناہ دی ہے۔

یہ سُنتے ہی نکولس لکڑیوں کے نیچے سے نِکل آیا۔ میتھیو نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا اور گرج کر بولا:

”کون ہو تم؟ کیا لینے آئے ہو یہاں؟“

نکولس نے ساری بات کہہ سنائی تو میتھیو نے کہا:

”میں زندگی میں پہلی بار رحم کھا رہا ہوں، اور تمہیں ایک شرط پر زندہ

چھوڑتا ہوں۔ جس راستے پر تم جا رہے ہو یہ تمہیں سیدھا اُسی چھلاوے کے علاقے میں لے جائے گا جِس کی تلاش میں نکلے ہو۔ میں نے بھی اپنی نوجوانی میں اُس سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ تمہارے والد نے یہ معاہدہ اَن جانے میں کیا تھا، لیکن میں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ اب جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا ہے، میری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے کہ خدا جانے وہ کِس دِن مُجھے لینے آ جائے۔ تمہیں اِس شرط پر زندہ چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ تو واپسی میں اِدھر سے ہو کر جانا اور مجھے بتانا کہ میرے متعلق چھلاوے کے کیا ارادے ہیں۔"

نکولس نے میتھیو کی شرط مان لی۔ پھر وہ آرام سے سو گیا۔ صُبح اُٹھا تو بُڑھیا نے اُس کا تھیلا کھانے کی چیزوں۔ سے بھر دیا اور وہ پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ چوہیا اسی طرح اُس کی رہ نمائی کر رہی تھی۔

اب راستہ اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیاں کہیں اُوپر کو جاتیں اور کہیں ڈھلان کی صورت میں نیچے کو۔ اِرد گرد کی پہاڑیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ برف کے تودے پھسل پھسل کر گِرتے تو نکولس

بڑی مشکل سے جان بچاتا۔

وہ اِس سرد پہاڑی علاقے سے گزر گیا تو آگے گرم علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں اُس نے ابلتے پانی کا ایک سمندر دیکھا۔ مختلف ملکوں کے پرندے یہاں سردیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ یہاں اُس نے ایک آنکھ والے آدم خوروں کو بھی دیکھا جن کے پیر بیلچوں جیسے تھے۔

نکولس یہ بات سمجھ چکا تھا کہ کوئی خاص طاقت اسے اِن سب مصیبتوں سے بچائے لیے جا رہی ہے۔ یہاں ہوا میں جگہ جگہ آگ کے شعلے اُڑ رہے تھے اور بہت بُری بو پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ آب وہ جنوں، پریوں اور چھلاووں کے علاقے میں آ گیا ہے۔

دلدلوں میں سے درختوں کے جلے ہوئے تنے اُچھل اُچھل کر باہر گر رہے تھے ۔ جنگل سانپوں، بچھّوؤں سے بھرے پڑے تھے۔ سو سو سروں والے اژدہے دانت نکالے پھر رہے تھے۔ آخر کُچھ آگے جا کر نکولس کو چھلاوے کا محل نظر گیا۔ یہاں زمین صاف اور ہموار تھی اور

اس پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔

نکولس محل میں داخل ہو گیا۔ وہ جس طرف بھی جاتا دروازے خود بخود کھُل جاتے۔ چوہیا اب بھی اُسے راستہ دِکھا رہی تھی۔ جب وہ آخری دروازے میں سے ہو کر بڑے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے میز پر وہ کاغذ پڑا نظر آیا جس پر اس کے باپ نے اپنے خون سے دستخط کیے تھے۔

اس نے جھپٹ کر کاغذ اُٹھایا اور اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ کمرے میں لمبی لمبی میزوں پر عُمدہ عُمدہ لذیذ کھانے چُنے ہُوئے تھے۔ لیکن بھوکا ہونے کے باوجود اُس نے اُن کی طرف دھیان نہ دیا۔ اُس نے کاغذ جیب میں ڈالا تو اُسے وہ وعدہ یاد آ گیا جو اُس نے میتھیو سے کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت تک یہاں سے نہیں جانا چاہیے جب تک میں چھلاوے سے میتھیو کے بارے میں نہ پوچھ لوں۔

اس کا یہ سوچنا تھا کہ چوہیا کمرے میں ایک جگہ بار بار گھومنے لگی۔ نکولس نے اُس جگہ تہہ خانہ دیکھا۔ نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ وہ نیچے اُتر گیا۔

یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ پہلے پہل تو اُسے کُچھ نظر نہ آیا۔ پھر اچانک اُبلتے ہوئے تیل کی بُو آئی، جیسے پکوڑے تلنے والی کڑاہی سے آتی ہے۔ وہ کمرے کے دائیں کونے کی طرف گیا تو اس سے آگے ایک اور کمرا تھا اور اس میں روشنی ہو رہی تھی۔ نکولس وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت بڑی کڑاہی میرا تیل کھول رہا ہے اور پاس ہی دیوار پر لکھا ہے:

"میتھیو کی قبر۔"

نکولس کو بہت دکھ ہوا اور وہ فوراً ہی محل سے باہر نِکل آیا۔ اب چوہیا اس کے آگے آگے نہ تھی۔ بلکہ جوں ہی وہ محل سے نِکلا اس نے ایک اُلّو نے اس چوہیا کو پنجوں میں پکڑ رکھا تھا۔

واپسی میں اُسے سب کُچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ نہ وہ آدم خور، نہ سانپ، نہ دلدلیں اور نہ وو پہاڑیاں۔ وہ بغیر کِسی دِقّت کے میتھیو کے غار تک پہنچ گیا۔ یہاں اب وہ بُڑھیا نہ تھی۔ میتھیو رات کو آیا اور نکولس نے اُسے بتایا کہ چھلاوا اُس کو تیل میں تل کر کھانے کا انتظام کر رہا ہے تو اُس نے گھبرا

کر کہا ”اب مجھے کیا کرنا چاہیے ؟“

نکولس بولا ”یہ جو تمہارا کوڑا ہے نا، یہ خونی کوڑا جس سے تُم نے نہ جانے کتنے لوگوں کو قتل کیا ہے، اِسے زمین میں بو دو۔ پھر اسے ایک چشمے کے پانی سے سینچو لیکن چشمے سے پانی کِسی برتن میں نہیں، مُنھ میں بھر کر لانا ہے اور گھٹنوں کے بل چَل کے آنا ہے۔ جب تک یہ کوڑا پھوٹ نہ نکلے اور اس میں شاخیں اور پتّے نکل نہ آئیں، اسے اسی طرح پانی دیتے رہنا۔ تمہاری مصیبت ٹل جائے گی۔“

میتھیو کو یہ ہدایت دے کر نکولس اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی کیوں کہ ان کا بیٹا بڑی بہادری کا کام کر کے آیا تھا۔ جب نکولس کے بوڑھے والدین فوت ہو گئے تو اس نے ان کی چھوڑی ہوئی تمام دولت غریبوں میں بانٹ دی اور خود دنیا چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا۔ جنگل سے اُسے بچپن سے پیار تھا۔

ایک دِن وہ ذرا دُور نِکل گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پھُولوں کی

خوش بُو پھیلی ہوئی تھی۔ نکولس کے ساتھ ایک گڈریا لڑکا بھی تھا۔ اس نے سیب کے ایک درخت کے نیچے ِگرے ہوئے سیب اکھٹے کر لیے۔ لیکن جُوں ہی اس نے درخت کی شاخ پر سے سیب توڑنا چاہا تو ایک آواز آئی:

"یہ پھل مت توڑو۔ یہ درخت تم نے نہیں بویا تھا۔"

گڈریا یہ سُن کر خوف زدہ ہو گیا اور اس نے یہ بات نکولس کو بتائی۔ نکولس کو اپنی جوانی کا واقعہ یاد آ گیا، بھگ کر سیب کے درخت کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ درخت کا تنا دراصل خود میتھیو تھا اور اس کے بازو، داڑھی کے بال اور سر کے بال ٹہنیوں اور پتّوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

نکولس کو دیکھتے ہیں وہ چلّایا "تم نے مجھے سیب کے درخت کی لکڑی کا کوڑا زمین میں بونے کو کہا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا، اسے پانی دیتا رہا اور ایک دِن خود ہی درخت بن گیا۔"

نکولس درخت کے تنے کے پاس بیٹھ گیا اور میتھیو نے اپنے تمام گناہوں

کا ایک ایک کر کے اقرار کرنا شروع کر دیا۔ جب بھی وہ اپنے کسی گناہ کی معافی مانگتا، درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر گرتا اور لڑھک کر دُور چلا جاتا۔ جب وہ اپنے تمام گناہوں کی معافی مانگ چکا اور خاموش ہوا تو انکولس نے دیکھا کہ درخت کے تمام سیب گر گئے ہیں اور درخت خاک کا ڈھیر بن چکا ہے۔ خاک کے اِس ڈھیر میں سے ایک سفید کبوتر نِکل کر اُڑ گیا اور آواز آئی:

”اب میں آزاد ہوں۔ اب چھلاوا میرا کُچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

جادُو کی تلوار

ایک امیر آدمی بیمار ہو گیا۔ جب موت قریب دکھائی دینے لگی تو اس نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا:

”بیٹے، میں اب اس دنیا سے جانے والا ہوں۔ میری موت پر افسوس نہ کرنا اور اپنے کام کاج میں لگ جانا۔ تُم چُوں کہ میرے اکلوتے لڑکے ہو، اس لیے میں تمھیں ایک خاص تحفہ دیتا ہوں۔ لیکن اس کا ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ تمھیں نقصان ہو گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک پرانے صندوق سے ایک تلوار نکالی اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا۔ ”یہ میری جادُو کی تلوار ہے۔ جب تک یہ تمھارے پاس ہے دنیا کی کوئی طاقت تمھارا کُچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ جنگ ہو، امن ہو، پیدل ہو یا گھوڑے پر سوار، ہر حالت میں یہ تلوار تمھاری حفاظت کرے گی۔ میں دعا کرتا ہُوں کہہ جس طرح زندگی بھر اس تلوار نے میرا ساتھ دیا ہے،

اسی طرح تمہارے کام آئے۔ لیکن اس سے کام لینے کے لیے ضروری ہے کہ تم ہمیشہ غریبوں کے کام اور کمزوروں کی مدد کرو، لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور کسی بے گناہ کا خون نہ بہاؤ۔ اور ہاں یہ مت بھولنا کہ مرتے دم تک اس راز کو راز ہی رکھنا، جیسے میں نے رکھا ہے۔"

"اپنی بہن سے بھی یہ راز چھپاؤں؟" لڑکے سے پُوچھا۔

"بالکل، اسے بھی کُچھ نہ بتانا۔" یہ کہہ کر بوڑھے نے آخری سانس لیا اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔

لڑکے کا نام جان تھا اور اس کی بہن کا نام آنوسیہ۔ وہ اس کی سوتیلی بہن تھی۔ جب بوڑھے کے کفن دفن کی رسمیں پوری ہو گئیں تو جان نے اپنی بہن سے کہا:

"بہن، ہمارے ابّا ہمارے لیے بہت بڑی جائداد چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ کا دیا سب کُچھ ہے۔ کِسی چیز کی کمی نہیں۔ تم یہاں آرام سے رہو۔ میں ذرا دنیا میں گھومنا پھرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہُوں کہ دریاؤں کے پار اور

پہاڑوں سے پرے کیا ہے۔"

آنوسیہ بولی "میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ میں بھی دنیا کی سیر کروں گی۔ یُوں کرو کہ تمام جائیداد فروخت کر کے روپیہ کمر سے باندھو اور سفر پر روانہ ہو جاؤ۔"

اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ تمام سامان فروخت کیا۔ قیمتی ہیرے جواہرات اور روپیہ پیسہ کمر سے باندھا اور چل کھڑے ہوئے۔

سات دِن تو وہ بڑے آرام سے سفر کرتے رہے۔ رات کو ستاروں کی چھاؤں یا چاندنی میں لیٹ رہتے اور دِن بھر چلتے رہتے۔ آٹھویں دِن شام کو وہ تھک کر چُور ہو گئے تو آرام کرنے کے لیے جگہ تلاش کی لیکن انہیں ایسا کوئی ٹھکانا نظر نہ آیا جہاں وہ اطمینان سے سو سکتے۔ ہر طرف دُھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ آگے جنگل تھا جس میں قبرستان کا سا سنّاٹا تھا۔

وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ اُن کا دِل چاہتا تھا کہ یہیں کہیں لیٹ رہیں۔ لیکن جنگلی درندوں کے خوف سے ایسا نہ کر سکتے تھے۔

جب اور کُچھ سمجھ میں نہ آیا تو جان ایک درخت پر چڑھا اور دُور دُور تک نظر دوڑائی کہ شاید کہیں کوئی روشن نظر آئے۔ لیکن اسے دکھائی نہ دیا۔ اب آنوسیہ ایک درخت پر چڑھی۔ اس نے بھی ہر طرف نظر دوڑائی تو دُور بہت دُور یوں نظر آیا جیسے بہت سے جگنو چمک رہے ہیں۔ وہ اُسی طرف چل دیے۔

تھوڑی دُور چل کر انہیں ایک محل کی دیواریں نظر آئیں۔ باہر سے یہ محل بہت لمبا چوڑا دکھا دیتا تھا۔ دراصل یہ ڈاکوؤں کا ٹھکانا تھا جو اُنہوں نے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا لیا تھا۔ لیکن جان اور آنوسیہ کو اس بات کا علم نہ تھا۔

وہ محل میں داخل ہوئے تو سوائے ایک بوڑھی عورت کے وہاں اور کوئی نہ تھا۔ محل کے کمرے سنگِ مَرمَر کے بنے ہُوئے تھے۔ تصویروں کے فریم سونے کے تھے۔ بُڑھیا چُولھے پر اپنے بارہ بیٹوں کے لیے کھانا پکا رہی تھی۔

یہ لڑکے تمام دِن اِرد گرد کے علاقوں میں تباہی مچائے رکھتے۔ کسی کو لوٹتے کسی کو جان سے مار ڈالتے، کسی کے مکان کو آگ لگا دیتے اور رات کو دیر گئے گھر واپس آتے۔

جان نے بُڑھیا سے کہا " اچھّی امّاں، ہم تھکے ہارے۔ کئی دِن سے کُچھ کھانے کو نہیں مِلا۔ ہم آپ کے بہت شُکر گزار ہوں گے اگر آپ ہمیں آج کی رات یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں اور تھوڑا بہت کھانے کو بھی دے دیں۔"

بُڑھیا بہت ہوشیار تھی۔ اس نے جان اور آنوسیہ کے لباس اور شکل و صورت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ امیر گھرانے کے ہیں۔ اُس نے اُن کی خُوب آؤ بھگت کی اور اُن کے لیے میز پر کھانا لگا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بارہ پلیٹیں اور لگا دیں۔ جان نے پُوچھا:

"آپ اتنے بہت سے لوگوں کے لیے کھانا کیوں لگا رہی ہیں؟"

"میرے بارہ بیٹے ہیں" بُڑھیا بولی "وہ دِن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر

میں بیچنے جاتے ہیں اور شام کو تھک ہار کر واپس آتے ہیں۔ میں اُن کے آنے سے پہلے کھانا تیار کر لیتی ہُوں۔"

جان کو بُڑھیا کی بات کا یقین نہ کیا۔ صرف لکڑیاں بیچنے سے تو لوگ اتنے امیر نہیں ہو جاتے۔ لیکن یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

کُچھ دیر بعد دروازہ کھُلا اور بُڑھیا کے بیٹے اندر داخل ہوئے ۔ وہ بہت خوف ناک اور بد صورت تھے۔ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی اُنھوں نے جان سے پُوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟

جان نے جواب دیا"پہاڑوں اور دریاؤں کے پار سے۔"

"اور جانا کدھر ہے؟"

"دنیا کی سیر کرنے۔"

ڈاکوؤں نے پُوچھا ک"یا سیر کرنے؟ آخر کوئی مقصد بھی تو ہو گا تمہارے سامنے۔"

جان نے کہا ”ابھی تو بس ہم نکلے ہی ہیں۔ کُچھ پتا نہیں کہاں کہاں جائیں گے۔“

ڈاکوؤں کا سردار بولا ”پھر تو شاید تم ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو۔“

جان نے کہا ”کیوں نہیں۔ جو کُچھ آپ کر سکتے ہیں وہ میں بھی کر سکتا ہُوں۔“

یہ سنتے ہی ڈاکوؤں نے زبردست قہقہہ لگایا اور بولے:

”یہ مت سمجھ لینا کہ ہم ہر کسی کو اپنی جماعت میں شامل کر لیتے ہیں۔ تم ذرا بہادُر دکھائی دیتے ہو اور جسم کے بھی مضبوط ہو۔ اگر تُم کُچھ کام کر کے دِکھا سکے تو ہم تمہیں اپنا ساتھی بنا لیں گے۔“

جان نے پُوچھا ”کیا کارنامہ کر کے دکھاؤں تا کہ تمہیں میری بہادُری کا یقین آ سکے۔“

اس پر ڈاکوؤں کا سردار اتنا ہنسا کہ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اس نے اپنی خُون میں لتھڑی ہوئی تلوار اپنے سر پر گھماتے ہوئے کہا:

"اس تلوار کے ساتھ ناچ کے ہی دِکھادو تو میں تمھیں بہادُر مان لُوں گا۔"

جان اُچھل کر کھڑا ہو گیا، اپنی بہن کو اپنے پیچھے چھپایا اور اپنے باپ کی دی ہوئی تلوار کا ایسا زور دار ہاتھ مارا کہ ڈاکوؤں کے سردار کا سر تَن سے جُدا ہو کر دُور جا گِرا۔

اس پر تمام ڈاکوؤں نے جان پر حملہ کر دیا لیکن اُس نے جادُو کی تلوار ایسی مہارت سے چلائی کہ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا سر کٹ کٹ کے گرنے لگا، یہاں تک کہ بارہ کے بارہ ڈاکوؤں کے سر کٹ گئے اور اُن کے دھڑ فرش پر خون میں لت پت تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔

بُڑھیا نے جب یہ صورت دیکھی تو بھاگ کر جان کے قدموں میں گِر پڑی اور گِڑ گِڑا کر بولی:

"خُدا کے لیے اے بہادر نوجوان، میری جان بخش دے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو مجبوراً وہ سب کرتی تھی جو یہ لڑکے کہتے تھے۔"

جان بولا "مجھے اِس تہہ خانے میں لے کر چلو جہاں یہ لوگ لوٹ مار کا

سامان جمع کرتے تھے، اور چابیاں بھی نکالو ورنہ تمہارا سر بھی اسی طرح تن سے الگ ہو جائے گا جیسے تمہارے اِن ظالم بیٹوں کا ہُوا۔"

بُڑھیا نے کانپتے ہاتھوں سے چابیوں کا گچھّا جان کو پیش کیا اور اسے لے کر تہہ خانے کی طرف چل دی۔ جان تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو وہاں دولت کے ڈھیر لگے دیکھے۔ کمرے کے ایک کونے سے سخت بدبُو آ رہی تھی۔ جان نے اُدھر کا رُخ کیا تو انسانی ہڈیوں کے ڈھیر نظر آئے۔ یہ نظّارہ بڑا دردناک تھا۔

جان نے ڈاکوؤں کے سردار کا دھڑ اُٹھایا اور ہڈّیوں کے اِس ڈھیر کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "سب سے پہلے تُم نے میرے سر پر تلوار گھُمائی تھی۔ پہلے تمہاری ہی باری ہے۔"

ایک ایک کر کے اُس نے تمام ڈاکوؤں کے کٹے ہوئے سر اور دھڑ تہہ خانے میں پھینک دیے۔ پھر بُڑھیا کو بھی اندر دھکیل کر تہہ خانے کے دروازے میں تالا لگا دیا۔

جان اور اس کی سوتیلی بہن آنوسیہ نے فرش سے خون کے دھبّے صاف کیے اور آرام سے سو گئے۔ صُبح اُٹھ کر اُنہوں نے چابیاں اُٹھائیں اور محل کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لی۔ دولت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کہیں ہیرے، کہیں زیورات، کہیں سونا ، کہیں چاندی، کہیں قیمتی کپڑے۔

دُوسرے دِن جان نے اپنی بہن سے کہا ”اب ہم یہیں رہیں گے۔“

آنوسیہ بولی ”تو کیا ہم اب آگے نہیں جائیں گے ؟“

جان نے کہا ”اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ قِسمت ہمیں یہاں لے آئی ہے۔ اب ہمیں قِسمت پر بھروسا کرنا چاہیے۔ تم نہا دھو کر کپڑے پہنو اور پھر محل کو اپنی مرضی کے مطابق سجاؤ۔ میں جنگل کی طرف جاتا ہوں اور کِسی جنگلی جانور کا شکار کرتا ہُوں۔“

جان کے جانے کے بود آنوسیہ نے گھر کے کئی کام کیے، لیکن اِدھر اُدھر پھرتے ہُوئے جب وہ تہہ خانے کے دروازے کے پاس سے گُزرتی تو

اُسے اندر سے کھُسر پھُسر کی آواز آتی، جیسے کُچھ لوگ باتیں کر رہے ہوں۔

ایک بار جب اس کے کانوں میں اپنا نام پڑا تو وہ چونکی اور کان لگا کر سُننے لگی۔ وہ ڈاکو جن کو جان نے قتل کر دیا تھا، اپنی بوڑھی ماں سے باتیں کر رہے تھے۔

پہلے تو وہ بڑی گھبرائی لیکن جب اُسے یاد آیا کہ تہہ خانے کے تالے کی چابیاں تو جان کے پاس ہیں اور اس کی مرضی کے بغیر یہ لوگ باہر نہیں نِکل سکتے تو اس کی ڈھارس بندھی۔

اُس نے سوچا کہ جب جان آئے گا تو پھر دروازہ کھول کر دیکھیں گے کہ کیا بات ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس کا اِرادہ بدل گیا اور وہ دروازے کے پاس جا کر بولی:

"اچھا، تو تم سب زندہ ہو؟"

ڈاکوؤں کے سردار کی آواز آئی "ہاں، ہم زندہ ہیں۔ ہماری ماں کے پاس

ایک خاص مرہم ہے جو جنگلی بوٹیوں سے تیار کیا گیا ہے۔ اس نے ہماری گردنوں پر مرہم لگا کر ہمارے سر جسموں سے جوڑ دیے اور ہم زندہ ہو گئے۔"

"لیکن اِس سے کُچھ فائدہ نہ ہو گا۔ بھائی جان آئیں گئے اور تمہارے سر پھر کاٹ دیں گے۔ اِس بار وہ بُڑھیا کو کبھی نہیں چھوڑیں گئے۔ پھر کیا کرو گے تُم؟"

اِس پر سب سے چھوٹا بھائی بولا "آنوسیہ رحم کھاؤ اور خود اپنے متعلق بھی سوچو۔ مُجھے تو تُم پر رحم آ رہا ہے کہ اِتنی خوب صورت لڑکی اور ایسی ویران جگہ پر اپنی عُمر گزار دے، جہاں نہ کبھی کِسی عورت کا گُزر ہوتا ہے، نہ کِسی مَرد کا۔ تمہاری جیسی لڑکی کو تو کِسی بادشاہ کے دربار میں ہونا چاہیے۔ اِس جنگل میں اپنے سنگ دِل بھائی کے ساتھ کب تک اپنی عُمر برباد کرو گی؟"

بُڑھیا بولی "مہیں آزاد کرو۔ میرا سب سے چھوٹا بیٹا جِس کی آواز تُم نے

ابھی سُنی تھی، تمہارے ساتھ شادی کرے گا۔ پھر یہ تمام ہیرے جواہرات تمہارے ہوں گے۔ اور تمہارا شوہر تمہیں ساری دنیا کی سیر کرائے گا۔"

آنوسیہ نے کہا:

"میرا خیال ہے پہلے میں تہہ خانے کی چابیاں اُڑا لوں تاکہ تُم لوگ آزاد ہو سکو۔۔۔"

"نہیں۔ وہ ہمیں پھر مار ڈالے گا، اور اگر ہماری ماں بھی مر گئی تو پھر ہمیں دوبارہ زندہ کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔"

سب سے چھوٹا بھائی بولا "ہمارے لیے اُسے مارنا بُہت مشکل ہو گیا۔ اسے تو کِسی چالاکی سے مارا جا سکتا ہے۔ تُم یُوں کرو کہ جھُوٹ موٹ بیماری کا بہانہ کر کے لیٹ جاؤ اور جب تمہارا بھائی پُوچھے کہ کیا بات ہے تو کہنا کی مُجھے ایک ایسی بیماری ہے جو جنگلی خرگوش کے دُودھ سے ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ اِس علاقے میں خرگوش نہیں ہیں۔ وہ جنگل میں بھٹکتا پھِرے گا۔

جنگل میں خوف ناک اژدہے، بھیڑیے، ریچھ اور شیر ہیں۔ وہ تمہارے بھائی کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔"

آنوسیہ اِس تجویز پر بہت خوش ہوئی۔ اس نے تہہ خانے کی سلاخوں میں سے اُنہیں کھانا دیا۔ وہ اتنے بھُوکے تھے کہ اگر اُنہیں کھانا نہ مِلتا تو وہ مُردوں کی ہڈّیاں ہی کھا جاتے۔ اِس کام سے فارغ ہو کر وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔

جان شکار سے واپس آیا اور اپنی بہن کو چُپ چاپ چارپائی پر لیٹا دیکھا تو اُس نے پُوچھا "بہن خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

آنونسیہ بولی "کیا بتاؤں بھیّا، میں تو آپ کے جاتے ہی بیمار ہو گئی، اور یہ بیماری سُنا ہے اُس وقت تک نہیں جائے گی جب تک میں جنگلی خرگوشنی کا دُودھ نہ پی لوُں۔"

جان یہ سُنتے ہی جنگل کی طرف نکل گیا۔ ڈاکوؤں نے آنوسیہ کو بتایا تھا کہ اِس جنگل میں خرگوش نہیں ہیں۔ لیکن جان کو جنگل میں سب سے پہلی جو

چیز نظر آئی وہ ایک خرگوشنی تھی جو ایک جھاڑی کی اوٹ میں اپنے بچّوں کو دُودھ پلا رہی تھی۔

جان نے بندوق سیدھی کی، نشانہ لیا اور قریب تھا کہ گولی داغ دیتا کہ خرگوشنی انسانی آواز میں بولی:

”نوجوان کیوں تکلیف کرتے ہو۔ بندوق نیچے کرو اور اپنی گولی کِسی اور موقعے کے لیے تیّار رکھو۔ جِس چیز کی تلاش میں تم نِکلے ہو وہ میں تمھیں دے دیتی ہوں۔“

جان خرگوشنی کو بولتے سُن کر بہت حیران ہوا اور جب اس نے اپنی بہن کی بیماری کے متعلق بتایا تو خرگوشنی بولی:

”میں تمہارے ساتھ چلتی ہُوں، تمہارے ہی پاس رہوں گی، اور جب بھی تمہاری بہن کو دُودھ کی ضرورت ہو گی میں دے دوں گی۔“

جان کو یہ بات پسند آئی۔ وہ خرگوشنی کو اپنے گھر لے گیا اور اسے ایک پنجرے میں بند کر دیا۔ پھر وہ خرگوشنی کے دُودھ کا پیالہ لے کر بہن کے

پاس گیا تو اُس نے دُور ہی سے پُوچھا "کیا آپ خرگوشنی کا دُودھ لے آئے، بھائی جان؟"

"ہاں بہن، یہ رہا۔۔۔"

آنوسیہ کو اِس دُودھ کی ضُرورت تو نہ تھی، لیکن مجبوراً پینا ہی پڑا۔ دُودھ پی کر بولی "اب طبیعت کُچھ ٹھیک ہُوئی ہے۔ بہت بہت شکریہ بھائی جان۔"

بہن کو تندرست دیکھ کر جان پھر شکار کے لیے نِکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی آنوسیہ تہہ خانے کی طرف بھاگی۔ ڈاکوں نے پُوچھا:

"تم نے اپنے بھائی کو خرگوشنی کا دُودھ لانے کو کہا تھا؟"

"کیا تھا؟" آنوشیہ بولی "اور وہ لے بھی آیا۔ میں پی بھی آئی۔"

یہ سُن کر ڈاکو بڑے حیران ہوئے، کیوں کہ اُنھوں نے کبھی اس جنگل میں خرگوش نہیں دیکھا تھا۔

”اب کیا کریں؟“ آنوسیہ نے پُوچھا۔

”اب تُم یُوں کرو۔۔۔“ ڈاکو بولے ”ایک بار پھر بیمار پڑ جاؤ اور اپنے بھائی سے کہو کہ بھیڑنی کا دُودہ لائے۔ یہاں بڑے خوف ناک اور خون خوار بھیڑیے رہتے ہیں۔ وہ تمہارے بھائی کی بوٹیاں کر دیں گے۔“

اُدھر جان جب جنگل سے واپس آ رہا تھا تو اُسے ایک لومڑی ملی اور انسانی آواز میں بولی:

”مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے کام آؤں گی۔“

جان نے اسے بھی ساتھ لیا اور خرگوشنی والے پنجے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ آنوسہی کے پاس آیا۔ وہ پھر چارپائی پر پڑی تھی۔

جان نے پریشان ہو کر پُوچھا ”کیا ہوا بہن؟ طبیعت کیسی ہے؟“

انوسیہ کراہتے ہوئے بولی ”کیا بتاؤں بھیّا، میری حالت ٹھیک نہیں۔ مجھے بھیڑنی کے دُودھ کی خُوش بُو آ رہی ہے۔ اگر بھیڑنی کا دُودھ پینے کو مِل جائے تو میری طبیعت سنبھل جائے گی۔“

جان اُسی وقت بھیڑنی کے دُودھ کی تلاش میں چل نِکلا۔ زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اُسے ایک بھیڑنی نظر آئی۔ وہ اپنے بچّوں کو دُودھ پلا رہی تھی۔ جان نے اُسے دیکھ کر بندوق اُٹھائی تو وہ بولی:

"نوجوان کیوں مجھے مارتے ہو۔ جس چیز کی تمھیں ضُرورت ہے وہ میں تمھیں دے دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے جان کا پیالہ دُودھ سے بھرا اور بولی "میں خُود بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ شاید ایک پیالے سے تمھاری بہن کو آرام نہ آئے۔ میں ہر وقت تمھارے پاس رہوں گی اور خدمت کروں گی۔"

جان نے بھیڑنی کو بھی لومڑی اور خرگوش کے ساتھ چھوڑ دیا۔ آنوسیہ نے بھیڑنی کا دُودھ پیا اور اِس بات پر حیران ہوئی کہ وہ جو بھی مُشکل کام بھائی کو بتاتی ہے، وہ کر دیتا ہے۔

اُس دِن جان گھر پر ہی رہا۔ اگلے دِن وہ پھر شکار کے لیے نِکلا۔ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اسے ایک خوف ناک سانپ دکھائی دیا جس کے چھ سر تھے۔

جان اسے دیکھتے ہی ایک درخت پر چڑھ گیا اور بندوق کے بجائے تیر کمان سے اُس کا نشانہ لیا۔ اِتنے میں سانپ انسانی آواز میں بولا:

"نوجوان، مجھے مار کر تمہیں کیا فائدہ ہو گیا؟ نہ میری کھال تمہارے کِسی کام آئے گی، نہ میں دُودھ دے سکتا ہوں۔ مارنے کے بجائے مُجھے ساتھ لے چلو۔ میں تمہاری خدمت کروں گا اور ضُرورت پڑنے پر تمہاری مدد کروں گا۔"

جان درخت سے کُود کر نیچے اُترا اور سانپ کے پاس پہنچا تو سانپ نے اسے ایک بانسری دی اور کہا:

"اس بانسری کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ جب تم اسے بجاؤ گے تو خرگوش، لومڑی، بھیڑنی اور میں تمہاری مدد کو پہنچ جائیں گے۔"

جان نے حیران ہو کر پُوچھا "تو کیا تمہیں ان سب جانوروں کے متعلق علم ہے؟"

"بالکل" سانپ نے کہا اور وہ دونوں گھر چل دیے۔

اُدھر آنوسیہ اور ڈاکو منصُوبے بنارہے تھے کہ جان کو کِس ترکیب سے قابو میں لایا جائے۔ آخر ڈاکوؤں کے سردار کے ذہن میں ایک اور شرارت آئی۔ وہ بولا:

"اس جنگل میں آٹا پیسنے کی ایک چکّی ہے جِس پر جنوں کا سایہ ہے۔ کوئی انسان اُدھر جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جنوں کے اثر سے چکّی ہر وقت خود بخود چلتی رہتی ہے۔ جب بھی کوئی بھُول چُوک کر اُس چکّی میں داخل ہوا، کبھی زندہ واپس نہیں آیا۔ تم ایک بار پھر بیمار پڑ جاؤ اور اپنے بھائی کو اُس چکّی کا پِسا ہوا آتا لانے کو کہو۔"

آنوسیہ بیمار پڑ گئی اور اس بار کُچھ زیادہ ہی چیخ پُکار کرنے لگی۔ جان سے اُس کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ وہ بولا:

"بہن میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہُوں؟"

آنوسیہ بولی "پتا نہیں میں نے خواب دیکھا ہے یا ایسے ہی مُجھے وہم ہو گیا ہے کہ اِس جنگل میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں ایک چکّی ہے، جِس میں

سفید آٹا پیسا جاتا ہے۔ میں اُس آٹے کی روٹی کھانا چاہتی ہوں۔"

جان بولا "یہ تمہارا وہم نہیں ہے، اور نہ تم نے خواب ہی دیکھا ہے۔ واقعی جنگل میں درختوں کے جھُنڈ میں کسی چکّی کے چلنے کی آواز آتی ہے۔ میں کئی بار اُس کے پاس سے گُزرا ہوں لیکن کبھی اُس کے اندر جانے کا اِتّفاق نہیں ہُوا۔ تمہاری خواہش ہر حالت میں پوری ہو گی۔ میں ابھی جاتا ہُوں اور اُس چکّی کا آٹا لے کر آتا ہوں۔"

جنگل میں ایک جگہ درختوں کے جھُنڈ میں، ایک جوہڑ کے پاس یہ چکّی بنی ہوئی تھی۔ اُس کے بڑے بڑے پاٹ تیزی سے گھُوم رہے تھے اور اُن کی آواز بہت دُور تک پہنچتی تھی۔ جان اندر داخل ہُوا۔ وہ اگلے کمرے میں گیا اور پھر دُوسرے میں ۔ یہاں ایک میز پر عمدہ آٹے کے بنے ہوئے کیک اور دوسری چیزیں پڑی تھیں۔ پانی کا جگ بھی رکھا ہُوا تھا۔ پاس ہی گلاس دھرا تھا۔

جان نے خوب کیک کھائے اور پانی پیا۔ پھر وہ اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ

چکّی کا مالک آئے تو اُس سے آٹا خریدے اور حساب بے باق کر کے چلا جائے۔ لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ انتظار سے تنگ آکر اُس نے کُچھ آتا تھیلے میں ڈالا ایک روٹی اور ایک کیک بھی لیا اور پھر میز پر کُچھ رقم رکھ کے واپس جانے کے لیے مُڑا۔

جوں ہی اُس نے واپس جانے کا ارادہ کیا، باہر کا دروازہ ایک زور دار جھٹکے سے بند ہو گیا۔ وہ بہت گھبر ایا۔ اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ دیواریں اتنی اُونچی تھیں کہ آسانی سے پھلانگی نہیں جاسکتی تھیں۔

پہلے تو اُس کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا۔ پھر اچانک اُسے اُس بانسری کا خیال آیا جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ سانپ نے یہ بانسری اُسے ایسے ہی موقعوں کے لیے تو دی تھی۔ اُس نے بانسری بجانی شروع کر دی۔

بانسری کا بجنا تھا کہ جان کے گھر پنجرے میں بند خرگوشنی نے چلّانا شروع کیا۔ ”اُٹھو۔۔۔۔ اُٹھو۔۔۔ بھاگو۔۔۔ ہمارا آقا سخت تکلیف میں ہے۔ جلدی کرو۔“

خرگوش، لومڑی، بھیڑنی اور سانپ پنجرے میں سے نِکل کر چکّی کے پاس پہنچے اور دروازہ توڑ ڈالا۔ جان بانسری بجاتا ہوا باہر نِکلا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھر گیا۔ جان نے آنوسیہ کو روٹی دی، کیک دیا اور آٹا بھی دے دیا۔

جان بہت تھک چُکا تھا وہ لیٹے ہی سو گیا۔ آنوسیہ حیران تھی کہ اب کیا کرے؟ جان سو گیا تو وہ بھاگی بھاگی ڈاکوؤں کے پاس گئی اور بولی:

”یہ ہے چابیوں کا گچھّا۔ میں آپ کو باہر نکالتی ہوں۔ اس وقت جان سویا ہوا ہے۔ آپ لوگ اس کا کام تمام کر دیں۔ پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔“

ڈاکو بولے ”نہیں نہیں۔ اس طرح نہیں۔ پچھلی باتوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ تمہارا بھائی عام آدمی نہیں ہے۔ اس میں ایک عام انسان کی طاقت سے بڑھ کر طاقت ہے۔ اسی لیے تو وہ ہر بار بچ نِکلتا ہے۔ تُم پہلے اُس کی طاقت کا راز معلوم کرو۔ اس کے بغیر ہم اُس کا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

آنوسیہ بولی ”لیکن کیا وہ مُجھے اپنی طاقت کا راز بتا سے گا؟“

ڈاکو بولے ”کیوں نہیں۔ وہ تم سے بہت محبّت کرتا ہے۔ تم نے جہاں اُسے بھیجا، وہ گیا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اُس نے تمہاری خواہش پوری کی۔“

آنوسیہ نے کہا ”اگر اُس نے بتا بھی دیا تو پھر کیا ہو گ؟“

ڈاکو بولے ”یہ تُم ہم پر چھوڑ دو۔ ہم جانیں اور ہمارا کام۔“

آنوسیہ نے جان کو جگایا اور ضِد کر کے بولی ”مجھے صرف ایک بات بتا دیجئے۔ آپ کی طاقت کا راز کیا ہے؟“

جان نے کہا ”یہی ایک بات ایسی ہے جو میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ ابّا نے مرتے وقت مجھے تاکید کی تھی کہ یہ راز کِسی کو نہ بتانا۔“

جان نے بہت کوشش کی کہ بہن کو ٹال دے لیکن وہ کسی طرح نہ مانی۔ آخر کار وہ بولا:

"میری طاقت اِس تلوار میں ہے جو ابّا جان نے مرتے وقت مُجھے دی تھی ،اور ہدایت کی تھی کہ میں کبھی اس کو اپنے سے جُدا نہ کروں۔"

یہ سُنتے ہی آنوسیہ بے چین ہو گئی۔ وہ جان سے بولی "بھائی جان ، آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، آرام کریں۔ میں آپ کے کپڑے دھوتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھی ڈاکوؤں کے پاس گئی تالا کھول کر اُنہیں باہر نکالا اور تلوار والی بات بتا دی۔ ڈاکو بھاگ کر جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور اُن کے سردار نے دیوار پر سے تلوار اُتار لی۔ جان اب بہن کی دغا بازی کو سمجھ چکا تھا، لیکن بے بس تھا۔

ڈاکوؤں کے سردار نے تلوار لہراتے ہوئے کہا "اب کہاں جاؤ گے؟ تمہاری ساری طاقت تو اب ہمارے پاس ہے۔ اب تم اپنی گردن کٹوانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمہارے پاس تو وہ مرہم بھی نہیں ہے جِس سے ہماری ماں نے ہمارے سر جوڑ دیے تھے۔"

جان بولا "ٹھیک ہے۔ لیکن میری گردن اُڑانے سے پہلے مجھے خُدا سے

اپنے گناہوں کی معافی مانگ لینے دو۔“

”منظور ہے۔“ڈاکوؤں کا سردار بولا ”جلدی کرو۔“

آنوسیہ ڈاکوؤں سے بولی ”اس کی باتوں میں مت آؤ۔ جلد اِس کا کام تمام کرو، ورنہ یہ کِسی نہ کِسی طرح پھِر بچ نکلے گا۔“

”تُم فکر نہ کرو۔“ڈاکو بولے ”اب یہ نہیں بچ سکتا۔“

دُعا سے فارغ ہو کر جان بولا ”ایک آخری خواہش اور ہے۔“

”وہ کیا“؟

جان نے کہا ”مجھے آخری بار اپنی بانسری بجا لینے دو، ورنہ میری روح مرنے کے بعد بے چین رہے گی۔“

ڈاکوؤں نے جان کو بانسری دے دی۔ اُس نے بانسری بجائی تو خرگوشنی کے کان کھڑے ہو گئے۔ خرگوشنی کی سُننے کی طاقت سب جانوروں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ بولی ”ہمارا آقا سخت خطرے میں ہے۔“

جان کے چاروں وفادار ساتھی اُس کی مدد کو دوڑے۔ وہ سب کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکوؤں کے ہوش اُڑ گئے، سانپ نے ڈاکوؤں کے سردار کے جسم کو جکڑنا شروع کیا تو اُس کے ہاتھ سے تلوار گِر گئی۔ دوسرے ڈاکو نے تلوار اُٹھانا چاہی تو بھیڑنی نے اُس کی کلائی میں دانت گاڑ دیے۔ اب سانپ کے چھ سروں کی پھُنکار کے سامنے کِسی کی جرأت نہ تھی کہ تلوار کو ہاتھ لگا سکتا۔

جان نے آگے بڑھ کر تلوار اٹھالی۔ ڈاکو تھر تھر کانپنے لگے۔ اب وہ بے بس ہو چکے تھے۔ جان نے کُچھ فصلہ نہ کیا بلکہ خرگوشنی کو جج بنایا کہ وہ تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرے اور ان کے لیے کوئی سزا تجویز کرے۔

خرگوشنی نے عدالت لگائی، سب کے بیان سُنے اور پھر فیصلہ دیا کہ ڈاکو اور اُن کی ماں مجرم ہیں۔ اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں اور سانپ انھیں باری باری ڈسے۔

آنوسیہ کا جُرم بہت بڑا تھا۔ خرگوشی نے فیصلہ سُنایا کہ آنوسیہ کو چھت سے باندھ کر اُلٹا لٹکا دیا جائے، یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ جان یہ فیصلہ سُن کر پریشان ہو گیا۔ اُس کی بہن نے اُسے بہت دھوکے دیے تھے، لیکن وہ پھر بھی اُس سے محبّت کرتا تھا۔ اُس نے خرگوشی سے اپیل کی کہ وہ آنوسیہ پر رحم کھائے اور اُس کی سزا کم دے۔

خرگوشی نے آنوسیہ کی سزا میں کُچھ تبدیلی کر دی اور حکم دیا کہ اس کو چھت سے اُلٹا لٹکا دیا جائے اور نیچے فرش پر ایک بالٹی رکھ دی جائے۔ جب یہ بالٹی آنوسیہ کے آنسوؤں سے بھر جائے تو پھر اُس کو چھوڑ دیا جائے۔

وہ لوگ اب اس منحُوس محل میں نہ رہنا چاہتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی جان اور اس کے چاروں دوست وہاں سے نِکل کھڑے ہوئے، اور سات میل لمبے جنگل میں سے گُزر کر تین دریاؤں اور کئی پہاڑیوں کو عُبور کر کے ایک ایسے بادشاہ کی سلطنت میں داخل ہوئے جس کی بیٹی کی خوب صُورتی کی دُور دُور تک دھُوم مچی ہوئی تھی۔

اس شہزادی نے قسم کھائی تھی کہ وہ اُس شخص سے شادی کرے گی جِس کی تلوار کا دستہ سیاہ لومڑی کی کھال کا بنا ہو گا اور جس کے ساتھ ایک سانپ، ایک خرگوش، ایک بھیڑیا اور ایک لومڑی ہو گی۔ ایسا آدمی اُس نے خواب میں دیکھا تھا اور اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کرے گی تو اُسی سے۔

جب جان کے چاروں ساتھیوں نے یہ دیکھا کر اُس کی شادی ایک شہزادی سے ہونے والی ہے تو وہ اس کے پاس گئے اور بولے:

"ہم نے جہاں تک بھی ہو سکا، آپ کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔"

جان بولا "اس میں کیا شک ہے۔ مُجھ پر تمہارے بُہت ہی احسانات ہیں۔ میں تو تمہارا غُلام ہُوں۔" وہ بولے "پھر ہم جو کُچھ کہیں آپ کو اُس پر عمل کرنا ہو گا۔"

جان نے کہا "تمہارے کہنے کی دیر ہے۔ کُچھ کہو تو۔"

جان کے ساتھیوں نے اُس کو بتایا کہ وہ بھی اُسی کی طرح انسان ہیں۔ بُرے کاموں کی وجہ سے جانور بن گئے تھے۔ اب اُنہوں نے ایک بہادر انسان کی اِتنی خدمت کی ہے تو اُنہیں یقین ہے کہ اُن کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اُنہوں نے جان سے کہا:

"آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ یہ جو آپ کے پاس آپ کے والد کی تلوار ہے، اس سے ہم چاروں کے سر تن سے جدا کر دیں۔"

جان بولا "یہ مُجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ آپ لوگوں نے قدم قدم پر میری جان بچائی ہے اور اب میں اِس کا بدلہ یہ دوں کہ آپ کو قتل کر دوں؟ یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

خرگوشنی نے کہا "اگر آپ ہمیں ہماری اصل شکلوں میں واپس لانا چاہتے ہیں تو سوائے اِس کے کوئی چارہ نہیں کہ آپ ہمارے سر کاٹ دیں۔"

تب جان نے روتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ اُن کی بات پر عمل کرے گا۔ اِس پر خرگوشنی نے کہا "جب سارے سر کٹ نہ جائیں تو ہمارے جسم کو

جلا دینا اور راکھ کو زمین میں دبا دینا۔ زمین سے درخت اُگیں گے اور رات ہی رات میں بڑھ جائیں گے۔ اِن درختوں کو کاٹ کر پھر جلا دینا اور اُن کی راکھ کو زمین میں دبا دینا۔ اس کے بعد جب آسمان پر بارہ ستارے ظاہر ہوں تو سمجھ لینا کہ ہماری روح آزاد ہو گئی ہے۔"

جان نے ایسا ہی کیا۔ پہلے ان سب کے سر کاٹے، پھر جسم جلائے اور راکھ زمین میں دبا دی۔ اس راکھ سے درخت نِکل کر رات ہی رات میں بڑے ہو گئے تو جان نے اُن کو کٹوا کر جلا دیا اور اُن کی راکھ دوبارہ زمین میں دفن کر دی۔

اسی سال سردیوں کے موسم میں آسمان پر بارہ اور ستارے نمودار ہُوئے۔ ایک خرگوش تھا، دو لومڑیاں، تین بھیڑیے اور چھ سانپ۔ جان اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہُوا کہ اُس کے دوستوں کی روحیں آزاد ہو گئی ہیں۔

نیکی کا بدلہ

ایک رات اتنی تیز آندھی آئی کہ درخت جڑوں سے اُڑ گئے، مکانوں کے چھجے اُڑ گئے اور لاتعداد پرندے گھونسلوں سے گِر کر مر گئے۔

ایک لکڑ ہارے نے سوچا کہ آندھی سے جنگل میں درخت کافی گِر گئے ہوں گے اور لکڑی آسانی سے مِل جائے گی۔ وہ صُبح دھُوپ نکلتے ہی جنگل کو چل کھڑا ہوا۔

جنگل میں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اور اِس پہاڑی کی ڈھلان پر ایک بہت بڑا درخت گِرا پڑا تھا۔ اس کا تنا ایک چٹان کے پتھّر پر پڑا تھا اور شاخیں پگڈنڈی پر پھیلی ہوئی تھیں۔

لکڑہارے نے درخت کی چھوٹی چھوٹی شاخیں کاٹنی شروع کیں تا کہ راستہ صاف ہو جائے۔ اچانک اُسے یوں محسُوس ہُوا جیسے کوئی دردناک

آواز آرہی ہو۔ اُس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ آواز پتّھر کے نیچے سے آ رہی ہے۔ بہت ہی باریک آواز تھی۔ کوئی جان دار تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

لکڑہارے سے رہا نہ گیا۔ اُس نے پتھّر کے پاس جا کر آواز دی:

"کون ہے؟ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

پتھّر کے نیچے سے باریک سی آواز آئی "خُدا کے لیے مُجھے یہاں سے نکالو۔ میری جان نِکلی جا رہی ہے۔ میں تمہیں اِس احسان کا بدلہ دوں گا۔"

لکڑہارا بولا "خُدا جانے تُم کون ہو اور میرے انسان کا کیا بدلہ دو۔"

آواز آئی "تمہیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو دوسرے لوگوں کو ان کے نیک کاموں کا مِلتا ہے۔ اس کی فِکر مت کرو۔"

لکڑہارے نے کُچھ دیر غور کیا۔ پھر بولا "لیکن یہ پتھّر اتنا وزنی ہے کہ میں کوشش بھی کروں تو اسے ہلا نہیں سکتا۔ یہ میری ہمّت سے باہر ہے۔"

آواز پھر آئی "تمہیں سارا پتھّر اُٹھانے کی ضُرورت نہیں۔ صُرف ایک کنارہ تھوڑا سا اُٹھادو۔ پھر میں خُود ہی باہر نکل آؤں گا۔ اپنی کُلہاڑی کا پھل پتھّر کے نیچے پھنساؤ اور دستے پر زور لگاؤ۔"

لکڑہارے نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے کُلہاڑی کے پھَل کو پتھّر کے نیچے پھنسا کر پورے زور سے پتھّر کو ہلایا تو کوئی چیز رینگتی ہوئی اس کے نیچے سے نِکلی۔ لکڑہارا حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سانپ کھڑا تھا جِس کے سات پھن تھے۔ بجائے اس کے کہ وعدہ کے مطابق لکڑہارے کو اِس کے اِحسان کا بدلہ دیتا، وہ پھُنکار کر بولا "اب میں تمہیں ڈسوں گا۔"

لکڑہارا گھبرا کر بولا "کیا کہا؟ مجھے ڈسو گے؟ کیوں؟ اس لیے کہ میں نے تمہاری جان بچائی ہے؟"

سانپ نے اپنی ساتوں زبانوں سے شعلے برساتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اس دنیا میں نیکی کا بدلہ بُرائی سے دیا جاتا ہے۔"

لکڑہارے کی سمجھ میں اور تو کُچھ نہ آیا، وہ چُپکے سے بھاگنے لگا۔ لیکن سانپ بھلا اُسے کہاں بھاگنے دیتا۔ اس نے لکڑہارے کی ٹانگ پکڑ لی اور بولا:

”میں نے یہی وعدہ کیا تھا کہ تمہیں وہی بدلہ دُوں گا جو دوسرے لوگوں کو ملتا ہے۔۔“

لکڑہارا بولا ”لیکن صرف تمہارے کہنے سے تو یہ بات نہیں ہو سکتی۔ مجھے لوگوں سے پوچھنے دو کہ جو نیکی میں نے تمہارے ساتھ کی ہے، اُس کا یہی بدلہ ملنا چاہیے جو تُم مجھے دینا چاہتے ہو!“

سانپ نے کہا ”خُوشی سے۔ بڑی خُوشی سے۔ تُم جِس سے چاہو پوچھ لو۔“

دونوں چل کھڑے ہُوئے۔ کُچھ دُور جا کر اُنہیں ایک بوڑھا گھوڑا دکھائی دیا جو گھاس کھا رہا تھا۔ سانپ نے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”چلو، گھوڑے سے فیصلہ کرائیں۔“

لکڑہارا بولا ”صرف اکیلا گھوڑا ہی نہیں، کم سے کم تین جانوروں سے پُوچھیں گے؟“

سانپ بولا ”تُم جتنے جانوروں سے چاہو، پوچھ لو۔ فیصلہ میرے ہی حق میں ہو گا۔“

وہ گھوڑے کے پاس جا کر بولے ”گھوڑے بھائی، ہمارا فیصلہ کرو۔“

گھوڑے کی ہڈّیاں نِکلی ہوئی تھیں۔ اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ بڑی مُشکل سے اُس نے سر اُوپر اُٹھایا اور کہا:

”کیا بات ہے؟“

لکڑہارا بولا ”میں درخت سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ ایک پھّر کے نیچے سے اس سانپ کے کراہنے کی آواز آئی۔“ یہ کہہ کر لکڑہارے نے تمام بات تفصیل سے گھوڑے کو بتائی اور آخر میں کہا ”اور اب یہ کہتا ہے کہ میں تجھے ڈسوں گا۔ کیا یہ انصاف ہے؟“

گھوڑا بولا ”سانپ دُرست کہتا ہے۔ اِس دنیا میں یہی بدلہ ہوتا ہے نیکی کا۔ مجھے دیکھ لو جب میں جوان تھا تو ایک امیر آدمی کی بگھّی کھینچتا تھا۔ میرے پاؤں میں گھنگرو بندھے ہوتے تھے، اور ہر روز شام کو میری مالش ہوتی تھی۔ عُمدہ سے عُمدہ کھانے کو ملتا تھا۔ لیکن جب میں بوڑھا ہو گیا تو اس شخص نے میری تمام عمر کی خدمت کا صلہ دیا کہ مجھے جنگل میں چھوڑ دیا،

جہاں ہر وقت بھیڑیوں اور دوسرے خُوں خوار جانوروں کا دھڑ کا لگا رہتا ہے۔"

لکڑہارا اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوا۔ بولا "آؤ دو جانوروں سے اور پُوچھ لیں۔ اگر اُنہوں نے بھی تمہارے حق میں فیصلہ دیا تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں ایک بوڑھا کتّا دکھائی دیا، جو بہت کمزور تھا۔ وہ ایک ہڈّی کو چچوڑ رہا تھا۔

لکڑہارے نے کتّے سے کہا "بھئی ہمارا ایک فیصلہ تو کر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے ساری کہانی کتّے کو کہہ سُنائی۔ کتّے نے غور سے ساری بات سُنی اور پھر بولا "سانپ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ یہاں نیکی کا وہی صلہ مِلتا ہے جو سانپ تمہیں دینا چاہتا ہے۔ مجھے دیکھو۔ جب میں جوان تھا تو جِس گھر میں مَیں رہتا تھا وہ لوگ مجھے کُرسی پر بٹھاتے تھے۔ اچھّے سے اچھّا کھانے کو دیتے تھے۔ جب میں بوڑھا ہو گیا

اور کسی کام کا نہ رہا تو گھر سے نکال دیا گیا۔ اُسی گھر سے جس کی میں نے تمام عُمر رکھوالی کی۔ غیروں کو اُس کے اندر داخل نہ ہونے دیا اور چوروں کو بھونک بھونک کر بھگایا۔ اب میں بھوکوں مر رہا ہوں۔ دیکھا تم نے، میاں لکڑہارے؟ نیکی کا یہ بدلہ مِلتا ہے۔ سانپ کُچھ غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

اب وہ تیسرے جج کی تلاش میں نکلے۔ جلد ہی انہیں ایک دُبلی پتلی، مریل سی گائے مِل گئی جو زمین پر بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ سانپ اور لکڑہارے کو دیکھ کر اس نے بھاگنا چاہا لیکن اُس سے اُٹھا ہی نہ گیا۔ لکڑہارے نے اُس سے کہا:

"بی گائے، ذرا ہمارا فیصلہ تو کر دو۔"

گائے بولی "خیریت تو ہے؟ کیا مُشکل آ پڑی؟"

لکڑہارے نے سارا قصّہ دہرایا تو گائے بولی "سانپ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ نیکی کا یہی بدلہ ہوتا ہے جو سانپ تُم کو دینا چاہتا ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میں نے تمام عُمر اِنسان کی خدمت کی۔ اپنے بچّوں کا حق مار کر اُس کے

بچّوں کو دُودھ دیا۔ لیکن جب میں بوڑھی ہو گئی اور میرا دُودھ خُشک ہو گیا تو میرے مالک نے میری تمام عمر کی خدمت کا یہ بدلہ دیا کہ مجھے ایک قصائی کے ہاتھ بیچ دیا کہ وہ مجھے پورے گھر کے میرا گوشت نہ دے اور میری کھال کے بوتے بنائے۔ وہ تو ایسا اِتّفاق ہوا کہ قصائی کا بچّہ مجھے لے کر اِدھر سے گزر رہا تھا کہ میں رسّی تُڑا کر بھاگ ورنہ اب تک مجھے نیکی کا وہ بدلہ مل چکا ہوتا جو یہ سانپ تمہیں دینا چاہتا ہے۔"

گائے کا فیصلہ سُن کر لکڑہارا بہت گھبر ایا۔ اُسے اپنی موت نظر آنے لگی۔

سانپ نے کہا "بس تین جج میرے حق میں فیصلہ دے چکے۔ چاہو تو ایک سے اور پوچھ لو۔ لیکن یہ آخری جج ہو گا۔"

وہ پھر آگے چل دیے۔ راستے میں ایک بھیڑ ملی۔ لیکن لکڑہارا جانتا تھا کہ بھیڑ بہت بزدل ہوتی ہے۔ وہ سانپ سے ڈر جائے گی اور اُسی کے حق میں فیصلہ دے گی۔

لکڑہارا دراصل لومڑی کی تلاش میں تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کر لومڑی

بہت عقل مند اور سمجھ دار ہوتی ہے۔ اِتّفاق کی بات اُسی وقت ایک لومڑی اُدھر سے گُزری۔ لکڑہارے نے اُس سے کہا:

"بی لومڑی، ذرا سُنو تو۔۔۔"

لکڑہارے کے ہاتھ میں کلہاڑی دیکھ کر لومڑی بھاگنے لگی تو وہ جلدی سے بولا "ڈرو نہیں۔ ہم تو تُم سے ایک فیصلہ کروانا چاہتے ہیں۔"

"کیسا فیصلہ؟" لومڑی نے پُوچھا۔

لکڑہارے نے ساری بات اُسے بتائی تو وہ بولی "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تُم دونوں کے بیان علیٰحدہ علیٰحدہ سُنوں گی۔"

سانپ فوراً راضی ہو گیا۔ لومڑی لکڑہارے کو ایک طرف لے جا کر بولی "میں تمھیں یقین دِلاتی ہوں کہ تُمہارے حق میں فیصلہ کروں گی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم اس کے بدلے میں مجھے کیا دو گے؟"

لکڑہارا بولا "تُم جو چاہو گی دُوں گا۔ فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔"

لومڑی نے کہا ”تُم ہر اتوار کو مجھے ایک موٹی تازی مُرغی کھانے کو دے سکو گے؟“

لکڑہارا بولا ”دوں گا۔ اور ہاتھ باندھ کر دوں گا۔“

لومڑی بولی ”ٹھیک ہے۔ میں فیصلہ تمہارے حق میں کروں گی۔ لیکن اپنا وعدہ بھُول نہ جانا۔“

اب وہ سانپ کو ایک طرف لے گئی اور اس سے کہا ”بات یہ ہے کہ تمہارا گواہ تو کوئی موجود نہیں اور گواہی کے بغیر صحیح فیصلہ دینا بہت مُشکل ہوتا ہے۔ ہاں ایک صُورت ہے کہ میں اُس پتھّر کو دیکھوں جِس کے نیچے تُم دبے ہوئے تھے۔ اس سے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ ورنہ یا تو تمہارے ساتھ بے انصافی ہو جائے گی یا لکڑہارے کے ساتھ۔“ وہ تینوں پتھّر کے پاس پہنچے تو لکڑہارا بولا ”سانپ اِس پتھّر کے نیچے تھا۔“

لومڑی نے پُوچھا ”تُم نے اسے باہر کیسے نِکالا؟“

”میں نے اپنی کُلہاڑی کا پھل پتھّر کے نیچے پھنسایا اور اُس کو ذرا سا اُوپر اُٹھا

دیا۔ سانپ باہر نِکل آیا۔"

لومڑی بولی "کِس طرح؟ اُٹھا کر دکھاؤ۔"

لکڑہارے نے کُلہاڑی کا پھل پتھّر کے نیچے پھنسایا اور دستے پر زور لگا کر پتھر کو ذرا سا اُوپر اُٹھا دیا۔

لومڑی سانپ سے بولی "تُم پتھّر کے نیچے لیٹ جاؤ تاکہ میں دیکھ سکوں کے لکڑہارے نے تمہیں باہر نکالنے میں کُچھ محنت بھی کی ہے یا یوں ہی احسان جتا رہا ہے۔"

سانپ اپنے سات سَروں کے باوجود اتنا ذہین نہ تھا۔ وہ رینگ کر پتھّر کے نیچے داخل ہُوا اور اُس طرح لیٹ گیا جیسے پہلے لیٹا ہُوا تھا۔ لومڑی نے لکڑہارے کو اشارہ کیا۔ اُس نے جلدی سے کلہاڑی پتھّر کے نیچے سے کھینچ لی۔ سانپ پتھّر کے نیچے دب گیا۔

لومڑی بولی "لو، سانپ میاں تمہارا فیصلہ ہو گیا۔ اب یہاں لیٹے رہو، جب تک تمہارا جی چاہے۔"

لکڑہارا بہت خوش ہُوا۔ اُس نے لومڑی سے کہا "بُہت خُوب، کمال کر دیا تُم نے! اب آؤ، میرا گھر دیکھ لو۔"

لومڑی نے لکڑہارے کا مکان دیکھ لیا۔ اب وہ ہر اتوار آتی اور لکڑہارے سے ایک موٹی تازی مرغی لے جاتی۔ آہستہ آہستہ لکڑہارے کی تمام مُرغیاں ختم ہوگئیں تو اُس نے گاؤں کے لوگوں کی مرغیاں چُرانا شروع کردیں۔ لیکن کب تک۔ گاؤں والوں کو لکڑہارے پر شک ہوگیا اور اُس نے بدنامی سے بچنے کے لیے ایک دِن فیصلہ کیا کہ لومڑی کا کام تمام کر دیا جائے۔

اتوار کی شام کو لومڑی کے آنے کا وقت ہوا تو لکڑہارے نے بندوق بھری اور درختوں کے پیچھے چھُپ کر بیٹھ گیا۔

لومڑی خوش تھی کہ موٹی مرغی کھانے کو ملے گی لیکن یہاں معاملہ ہی اور تھا۔ لکڑہارے نے ایسا تاک کت نشانہ مارا کہ گولی لومڑی کے دِل کو چیرتی ہوئی نِکل گئی۔

کہکشاں

کسی بادشاہ کے محل میں ایک بہت خُوب صُورت باغ تھا۔ اُس نے اس کی دیکھ بال کے لیے بہت سے مالی مُقرّر کر رکھے تھے۔

لیکن کُچھ عرصے سے ایسا ہو رہا تھا کہ روزانہ رات کو کوئی عجیب و غریب مخلوق باغ میں آتی اور درختوں کی شاخیں توڑ دیتی۔ بادشاہ مالیوں سے بڑا ناراض تھا۔ مالی ہر طرح کوشش کر رہے تھے کہ اُن لوگوں کو پکڑا جائے جو باغ کو تباہ کر رہے ہیں۔

آخر بہُت کوشش کے بعد مالیوں کو پتا چلا کہ آدھی رات کے قریب تین ہنس، باغ میں آتے ہیں لیکن صُبح جب پڑتال کی جاتی تو گھاس پر انسانی پاؤں کے نشان نظر آتے۔

بادشاہ نے باغ کی رکھوالی کے لیے چوکی دار رکھے۔ لیکن عجیب بات تھی

کہ جُوں ہی ہنسوں کے آنے کا وقت ہوتا چوکی داروں کو نیند آ جاتی اور اگلی صُبح درختوں کی کئی شاخیں ٹوٹی ہوئی ہوتیں۔

اس بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑے دو بیٹے تو کافی چاق و چوبند تھے لیکن چھوٹا بہت سُست اور ڈھیلا ڈھالا سا تھا۔ لوگ اُسے بے وقوف سمجھتے تھے۔

بادشاہ کے بڑے بیٹے باپ کی پریشانی پر خُود بھی پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ کِسی طرح باغ اُجاڑنے والوں کا پتا چل جائے۔ چُناں چہ سب سے بڑے شہزادے نے بادشاہ سے کہا:

”ابّا جان، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اُن لوگوں کا پتا چلاؤں جو ہمارے باغ کو تباہ کر رہے ہیں۔“

بادشاہ بولا ”ضُرور ضُرور۔ تُم یہ کام نہیں کروگے تو اور کون کرے گا۔“

بڑا شہزادہ شام ہوتے ہیں باغ میں داخل ہو گیا اور بادام کے درخت کے نیچے چھُپ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی آنکھ بند نہیں کرے گا۔ لیکن عین اُس وقت جب اُسے ہوشیار ہو کر

بیٹھنا چاہیے تھا اُس کی آنکھ لگ گئی۔ باغ میں آندھی آئی اور اُس آندھی میں تینوں ہنس اُڑتے ہوئے باغ میں اُترے۔

صُبح جب بادشاہ شہزادے کا کارنامہ دیکھنے آیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت مایوس ہُوا کہ شہزادہ گہری نیند سویا ہُوا ہے، اور اُس درخت کی تین شاخیں ٹوٹی ہوئی ہیں جِس کے نیچے وہ لیٹا تھا۔ بادشاہ کو بہت غصّہ آیا۔ وہ ناراض ہو کر بولا:

"اگر تُم میرے بیٹے نہ ہوتے تو میں تمہارے کان اور ناک کٹوا کر گدھے پر سوار کر کے، تمام شہر میں گھماتا! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اگلے دِن دوسرے شہزادے نے چوروں کو پکڑنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اُس کے ساتھ بھی وہی کُچھ ہُوا جو پچھلی رات بڑے شہزادے کے ساتھ ہُوا تھا۔

تیسرے دِن سب سے چھوٹے شہزادے نے باغ میں جانے کی اجازت چاہی تو بادشاہ نے کہا "تُم تو بالکل ہی گئے گُزرے ہو۔ تمہارے بڑے

بھائی جو بہت چالاک اور ہوشیار ہیں، یہ کام نہ کر سکے۔ تُم کون سا تیر مار لو گے۔"

لیکن جب چھوٹے شہزادے نے بہت ضد کی تو بادشاہ نے اجازت دے دی اور وہ شام کو باغ میں داخل ہو گیا۔ وہ یہ سُن چکا تھا کہ عین اُس وقت جب ہنس باغ میں داخل ہوتے ہیں، چوکی داروں کو نیند آ جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بھائیوں کی طرح وہ بھی سو جائے۔ اس نے چاقو سے اپنی انگلی پر زخم لگایا اور اُس کے اُوپر تھوڑا سا نمک چھڑک لیا تا کہ درد کی وجہ سے اُسے نیند نہ آئے۔

اندھیرا چھا گیا۔ پھر چاند اپنی پوری آب و تاب سے نِکلا اور تمام باغ چاندنی سے جگمگا اُٹھا۔ پھر بہکی بہکی ہوا چلنے لگی جو آہستہ آہستہ بہت تیز ہو گئی۔ شہزادہ سمجھ گیا کہ اب ہنسوں کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو دُور فضا میں تین چوٹے چھوٹے دھبّے دِکھائی دیے جو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہوتے گئے اور پھر تین سفید ہنس

تیزی لیکن خاموشی سے باغ میں اُترے۔ اُن کے پروں کی آواز بھی سُنائی نہ دی۔

شہزادہ چوکس ہو گیا اور جلدی سے ایک جھاڑی میں چھُپ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تینوں ہنسوں نے اپنے پر اُتار کر اُسی جھاڑی کے پاس رکھ دیے جہاں وہ چھُپا ہُوا تھا۔ اُن پروں کے اندر سے تین خُوب صُورت لڑکیاں نِکل کر گھاس پر ناچنے لگیں۔ اُن کے سنہری بال چاندنی میں بڑے ہی خُوب صُورت لگ رہے تھے۔

شہزادے نے سوچا کہ اگر میں نے پھُرتی سے کام نہ لیا تو یہ لڑکیاں جتنی تیزی سے آئی تھیں، اُتنی ہی تیزی سے واپس چلی جائیں گی اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جاتے وقت یہ کِسی درخت کی ٹہنیاں توڑ جائیں۔ پھر میں ابّا جان کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ لوگ تو پہلے ہی مجھے بے وقوف اور سُست کہتے ہیں۔

یہ سوچ کر وُہ بجلی کی سی تیزی سے جھاڑی میں سے نِکلا اور جھپٹ کر ایک

لڑکی کے پَر اُٹھا لیے۔ جتنی تیزی سے اُس نے پَر اُٹھائے اُس سے زیادہ تیزی کے ساتھ باقی دو لڑکیوں نے اپنے پَر اُٹھا کر بازوؤں پر لگائے اور ہنس بن کر اُڑ گئیں۔

اب ایک ہی لڑکی باقی رہ گئی تھی۔ وہ کانپتی ہوئی شہزادے کے پاس آئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی:

"خدا کے لیے میرے پَر واپس دے دو۔"

"ہرگِز نہیں ۔۔۔۔" شہزادہ بولا "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟"

لڑکی نے شہزادے کو بتایا "میں ایک بادشاہ کی لڑکی ہوں جِس کی سلطنت یہاں سے بہت دُور ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں جو ابھی گئی ہیں، میری بڑی بہنیں ہیں۔ ہمارے اُوپر کِسی دشمن نے جادُو کر دیا تھا۔ وہ ہمیں مجبور کرتا تھا کہ ہم ہنس کا بھیس بدل کر یہاں آئیں اور اِس خُوب صُورت باغ کے کِسی درخت کی ایک ایک شاخ توڑ کر لے جائیں۔"

شہزادہ بولا ”لیکن اب تو تُم ایسا نہیں کر سکو گی. اب میں تمہیں اپنے باپ کا خُوب صُورت باغ ہر گز اُجاڑنے نہیں دوں گا۔“

لڑکی نے کہا ”اب اِس کی ضرورت نہیں رہی۔ جادُوگر نے کہا تھا کہ جب تمہارے پَروں کو کِسی اِنسان کا ہاتھ لگے گا تو تمہارے اُوپر سے جادُو کا اثر ختم ہو جائے گا۔“

لڑکی شہزادے سے باتیں کر رہی تھی اور شہزادہ اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی اتنی خُوب صُورت تھی کہ شہزادے نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شادی کرے گا تو اِسی سے۔

شہزادے نے لڑکی کو اپنے باپ کے محل اور اس کی سلطنت کے قصّے سُنائے، اپنے بھائیوں کے متعلق بتایا اور پھر آخر میں کہا:

”اگر تُم میرے ساتھ شادی کر لو تو ہماری زندگی بڑی ہی خُوش و خُرم گُزرے گی۔“

شہزادی بولی ”افسوس! ابھی ایسا نہیں ہو سکتا۔“

"کیوں؟" شہزادے نے کہا۔

"اس لیے کہ پہلے مُجھے ہنس کی صُورت میں واپس اپنے دیس میں پہنچنا ہے۔"

شہزادہ بولا "وہ تو تُم اس وقت تک نہیں پہنچ سکتیں جب تک میں تمہارے پَر واپس نہیں کرتا۔"

"نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ" شہزادی بولی "ایسا ظلم نہ کرنا۔ اس طرح تو ہم ہنسی خوشی زندگی نہ گزار سکیں گے۔ اگر تُم نے میرے ساتھ زبردستی شادی کی تو جب بھی میرا دل چاہے گا تمہیں اور تمہارے بچّوں کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

شہزادہ بولا "تو پھر کوئی ایسا طریقہ بتاؤ کہ تم ہمیشہ میرے ساتھ رہ سکو۔"

شہزادی نے کہا "اس وقت تو مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہیں مجھے تلاش کرنا پڑے گا۔ میرے باپ کا مُلک دنیا کے اُس پار ہے اور اُس کا نام ہے 'کہکشاں'۔ میں تمہیں اپنے باپ کے

محل میں ہی ملوں گی۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ مُلک کہکشاں کو جو سڑک جاتی ہے، وہ بہت لمبی اور رُکاوٹوں سے پُر ہے۔ اِس مُلک کا راستہ تلاش کرنا اِتنا آسان نہیں ہے۔"

شہزادے نے کہا "کوئی اتا پتا تو بتاؤ۔"

شہزادی بولی "چاند سے پَرے، سُورج سے بھی پُرے اور اس جگہ سے بھی پَرے جہاں سے ہوائیں اور آندھیاں آتی ہیں، میرا مُلک ہے۔"

یہ کہتے ہوئے شہزادی ذرا پیچھے کو ہٹی۔ شہزادہ بے دھیان ہو گیا تھا۔ لڑکی نے جلدی سے اپنے پَر بازوؤں پر لگائے اور پلک جھپکتے میں ہنس بن کر اُڑ گئی۔

صُبح کو بادشاہ چھوٹے شہزادے کی خیر خبر لینے آیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہُوا کہ درختوں کی کوئی شاخ ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔ وہ کام جو سمجھ دار اور تیز طرار بڑے شہزادے نہ کر سکے تھے، چھوٹے اور سُست شہزادے نے کر دِکھایا تھا۔

بادشاہ نے شہزادے کی بہت تعریف کی اور اُسے بہت سا انعام دیا۔ لیکن شہزادہ تو شہزادی کے غم میں اُداس تھا۔ اُس نے بادشاہ سے کہا:

"ابّا جان میں ایک شہزادی کی تلاش میں کا رہا ہوں جِس سے میں شادی کروں گا۔"

بادشاہ نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی، بہت سمجھایا لیکن شہزادہ نہ مانا اور سفر پر چل کھڑا ہُوا۔ جِس گھوڑے پر وہ سوار تھا، وہ بہت تیز رفتار تھا۔ لیکن شہزادہ اِس قدر بے چین تھا کہ اُسے گھوڑے کی رفتار سُست معلوم ہو رہی تھی۔

سات روز کے بعد آخر وہ ایسے علاقے سے گزرا جہاں دُور دُور تک آبادی نہ تھی۔ ہر طرف پتھّر اور چٹانیں تھیں۔ اب اُسے کُچھ اُمّید ہوئی کہ شاید شہزادی ایسے ہی کِسی علاقے میں رہتی ہو گی۔ دِن گُزرتے گئے اور اُسے پتھّروں چٹانوں اور کھُلے آسمان کے علاوہ اور کُچھ نظر نہ آیا۔

وہ اپنے خیالوں میں گُم چلا جا رہا تھا کہ دُور، کُچھ فاصلے پہ تین جِن نظر آئے جو خنجر نکالے ایک دُوسرے سے لڑنے کے لیے تیّار تھے۔ شہزادہ اُن کے پاس گیا اور دریافت کیا:

”کیا بات ہے؟ کیوں لڑ رہے ہو؟“ اُن میں سے بڑا جِن بولا ”ہم تینوں بھائی ہیں۔ ہمارا باپ ہمارے لیے کُچھ جائداد چھوڑ گیا ہے۔ اسی کی تقسیم کے سلسلے میں ہم جھگڑ رہے ہیں۔“

شہزادے نے پُوچھا ”کیا جائداد چھوڑی ہے تُمہارے باپ نے؟“

اس پر جنوں نے اُسے بتایا کہ اُن کا والد جُوتوں کا ایک جوڑا چھوڑ گیا ہے جِن کو پہن کر انسان ایک قدم میں سات میل کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ ایک چادر ہے جِسے اوڑھنے والا دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک ٹوپی ہے جِس کے پیچھے ایک پَر لگا ہے۔ اگر ٹوپی کے پَر والا رُخ بدل کر آگے کر دیا جائے تو اِتنے زور کی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے سات توپیں ایک دم داغ دی گئی ہوں۔

شہزادہ کُچھ دیر غور کر کے بولا ”اِن چیزوں کو تقسیم نہ کرو بلکہ تُم میں سے جو سب سے زیادہ اِن کا حق دار ہو وہ تینوں چیزیں لے لے۔ لاؤ یہ مُجھے دے دو اور جب میں ایک دو تین کہوں تو تینوں بھاگو۔۔۔ وہ جو سامنے

پہاڑ نظر آ رہا ہے، اُس کی چوٹی کا پتھّر جو سب سے پہلے اُکھاڑ کر لائے گا وہی خوش قسمت تینوں چیزیں لے لے گا۔“

جِنوں نے اُس کی یہ تجویز مان لی اور جب اُس نے ایک دو تین کہا تو تینوں دوڑ پڑے۔ جُوں ہی اُنہوں نے دوڑنا شروع کیا، شہزادے نے فوراً جوتے پہنے، چادر اوڑھی اور ٹوپی سر پر رکھ کر غائب ہو گیا۔

اب اُس کا کام آسان ہو گیا تھا۔ اُسے اب گھوڑے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اُس کا ایک قدم سات میل کا تھا۔ وہ چلتا گیا۔ عجیب عجیب علاقے آتے گئے۔ شام تک وہ ایک دلدلی علاقے میں پہنچ گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے اب آگے جانا ممکن نہ تھا۔ وہ رات کاٹنے کے لیے وہیں رُک گیا۔

سونے سے پہلے اُس نے اِرد گرد نظر دوڑائی تو دُور جنگل میں روشنی سی نظر آئی۔ وہ اُسی طرف چل دیا۔ یہ روشنی ایک جھونپڑی میں سے آ رہی تھی۔ شہزادہ اُسی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک بُڑھیا بیٹھی تھی۔

شہزادے نے اُس سے جھونپڑی میں ٹھہرنے کی اجازت مانگی تو وہ بولی:

"میں چاند کی ماں ہُوں۔ آج وہ آسمان کا سفر جلدی ختم کر کے واپس آ جائے گا۔ اگر اُس کی روشنی تُم پر پڑ گئی تو اچھی بات نہ ہو گی۔"

لیکن شہزادے نے اِتنی ضِد کی کہ بُڑھیا نے مجبور ہو کر اِجازت دے دی۔ شہزادے کی ابھی آنکھ بھی نہ لگی تھی کہ چاند واپس گھر آ گیا اور آتے ہی پُوچھنے لگا:

"کون ہو تُم؟"

شہزادہ بولا "اے چاند، میں مُلک کہکشاں جانا چاہتا ہُوں۔ تُم ساری دنیا پر اپنی روشنی کی کِرنیں بکھیرتے ہو۔ مُجھے کہکشاں کا راستہ بتادو۔"

چاند بولا "کہکشاں کو جانے والا راستہ یہاں سے بہت دُور ہے۔ تمہیں ابھی ایک دِن اور ایک رات اور چلنا ہو گا۔ پھر کِسی سے پُوچھنا۔"

شہزادہ چلتا گیا۔ شام کے قریب وہ پھر ایک جنگل میں پہنچا۔ یہاں بھی اُسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہ جھوپڑی میں داخل ہوا۔ جھونپڑی میں

ایک بُڑھیا بیٹھی تھی۔ اُس نے بُڑھیا سے رات گزارنے کی اجازت چاہی تو وہ بولی:

"میں سُورج کی ماں ہوں۔ میرا بیٹا اب واپس گھر آنے والا ہے۔ اگر اُس نے تُمھیں دیکھ لیا تو اچھّا نہ ہو گا۔"

لیکن شہزادے نے ضِد کی تو اُس بُڑھیا نے بھی اُسے رات بسر کرنے کی اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد سُورج آ گیا اور اُس نے شہزادے سے وہی سوال کیا:

"کون ہو تُم اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

شہزادہ بولا "اے سُورج، میں مُلک کہکشاں جانا چاہتا ہوں۔ تُم نے ضُرور یہ مُلک دیکھا ہو گا۔ مُجھے اُس کا راستہ بتا دو۔"

سُورج نے کہا "میں نے یہ مُلک کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اِتنی دُور ہے کہ چاند اور سُورج کی روشنی وہاں نہیں پہنچتی۔ تُم ابھی اور آگے جاؤ۔ پھر کِسی سے راستہ پُوچھنا۔"

شہزادہ بے حد اُداس ہو گیا۔ وہ بہت تھک چُکا تھا لیکن شہزادی کی یاد اُس کے دِل سے نہ جاتی تھی۔ وہ پھِر آگے چل دیا۔ رات کو اُسے ایک بُڑھیا مِلی۔ یہ بُڑھیا پہلی دو بُڑھیوں سے زیادہ رحم دل تھی۔ اُس نے شہزادے کو بتایا ”میری سات بیٹیاں ہیں، اور یہ ساتوں وہ ہوائیں ہیں جو دُنیا میں گھومتی پھرتی ہیں۔ تُم ذرا انتظار کرو۔ شاید اُن میں سے کِسی کو کہکشاں کا پتا معلُوم ہو۔“

تھوڑی دیر کے بعد بُڑھیا کی بیٹیاں گھر میں داخل ہُوئیں تو شہزادے نے اُن سے کہا:

”اے ہواؤ، تُم ساری دنیا میں گھومتی پھرتی ہو۔ مُجھے کہکشاں کا پتا تو بتاؤ۔“

لیکن اُن میں سے کوئی بھی شہزادے کی مدد نہ کر سکی۔ اب تو شہزادے کا دِل ٹُوٹ گیا اور وہ روتے لگا۔ بُڑھیا نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو بولی:

”حوصلہ نہ ہارو۔ ابھی تو میری چھ بیٹیاں ہی آئی ہیں۔ ساتویں جو سب سے

زیادہ تیز ہے اور جِسے طوفان کہتے ہیں، ابھی آنے والی ہے۔ ذرا انتظار کرو، شاید وہ کُچھ بتا سکے۔"

اِتنے میں بُڑھیا کی ساتویں بیٹی بھی آگئی۔ جُوں ہی وہ جھونپڑی میں داخل ہُوئی، شہزادے نے اُس سے کہا:

"خُدا کے لیے مُجھے مُلک کہکشاں کا پتا بتا دو؟"

ہوا بولی "میں تو وہیں سے آ رہی ہیں۔ وہ اِتنی دُور ہے کہ تمہارا وہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن پہلے مجھے یہ تو بتاؤ تُم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟"

شہزادے نے ساری کہانی سُنائی تو ہوا افسوس کرتے ہوئے بولی "اگر تُم وہاں پہنچ بھی گئے تو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اُس شہزادی کی تو کل دوپہر کو شادی ہو رہی ہے۔ میں آج سارا دِن محل کی چھت پر شہزادی کی شادی کے کپڑے سُکھاتی رہی ہُوں۔"

شہزادہ بولا "تُم چاہو تو میری مدد کر سکتی ہو۔ شہزادی کی شادی کے تمام کپڑے اُڑا کر کیچڑ میں پھینک دو۔ اِس طرح شادی رُک جائے گی۔"

ہوا نے کہا "یہ تو میں کر سکتی ہوں۔ لیکن تُم بھی میرے ساتھ چلو۔ اگر میں شادی رُکوانے ہیں کامیاب ہو گئی تو پھر تمہیں وہاں موجود ہونا چاہیے۔ شہزادی اِس شادی سے خُوش نہیں۔ میں نے دیکھا تھا، وہ بہت اُداس تھی۔"

ہوا نے شہزادے کو اپنے ساتھ اُڑانا چاہاتُو وہ ہنس پڑا اور بولا "میرے بوٹ دیکھے ہیں تُم نے۔ میرا ایک قدم سات میل کا ہے۔ تُم میری فکر نہ کرو۔"

اور واقعی ایسا ہی ہُوا۔ شہزادہ ہوا سے میلوں آگے تھا، اور ہوا کو اُس کا ساتھ دینے کے لیے بہت تیز چلنا پڑ رہا تھا۔

آخر تنگ آکر ہُوا نے کہا۔ "دیکھو شہزادے، تُم شاید یہ نہیں جانتے کہ اگر میں زیادہ تیز چلوں تو دنیا میں تباہی آ جاتی ہے، درخت جڑوں سے اُکھڑ جاتے ہیں، فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، مکانات گر جاتے ہیں۔ اِس لیے بہتر یہ ہے کہ ذرا آہستہ چلو۔"

اب اُن کی رفتار پہلے سے کُچھ کم ہو گئی تھی وہ ایک بہت بڑے صحرا سے گُزر رہے تھے۔ ہر طرف ریت کے تودے اُڑتے پھرتے تھے۔ اس سے آگے ایسا علاقہ آیا جہاں دُھند چھائی ہُوئی تھی - ایسے پہاڑ آ گئے جِن پر صدیوں سے برف جمی ہوئی تھی۔ پہاڑوں کا یہی سلسلہ مُلک کہکشاں کی سرحد تھی۔

اِن پہاڑوں کو عُبور کرتے ہی وہ محل نظر آنے لگا جہاں شہزادی کی شادی کی تیّاریاں ہو رہی تھیں۔ ہوا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اِتنے زور سے چلی کے تمام جھنڈیاں، جھاڑ، فانوس اور قناتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ شادی کے کپڑے اُڑ اُڑ کر دُور پانی اور کیچڑ میں جا گرے۔ ہر طرف آفت سی مچ گئی اور شادی ملتوی کر دی گئی۔

شہزادے نے جادُو کی چادر اوڑھ لی۔ اب اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اُس کمرے میں گیا جہاں شہزادی اداس اور غمگین بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ شہزادہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ وہ کمرے میں پڑی ہوئی میز پر بیٹھ گیا۔ اُسے سخت بھوک لگی

تھی۔

خوش قسمتی سے میز پر ایک کیک اور چھُری پڑی تھی اور ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل بھی رکھی تھی۔ اس نے کیک کاٹ کر کھانا شروع کیا اور بوتل کو مُنہ لگا کر پانی پیا۔ وہ یہ دیکھ کر بڑا حیران ہُوا کہ کاٹنے کے باوجود کیک ویسے کا ویسا ہی رہا۔ پانی پینے کے بعد بھی بوتل اُسی طرح بھری رہی۔

جب اُس کا پیٹ بھر گیا تو وہ اطمینان سے شہزادی کے پاس آیا اور بولا

"حضُور، میں آ گیا ہُوں۔"

شہزادی آواز سُن کر ڈر کے چیخی تو محل کا چوکی دار بھاگا آیا۔ شہزادے نے اپنی ٹوپی کا رُخ بدل لیا اور پَر والا حصّہ سامنے کر لیا۔ ایک دم محل توپوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ تمام چوکی دار اور محافظ بھاگے چلے آئے۔ بادشاہ اور ملکہ بھی آ گئے۔ بادشاہ نے کہا:

"تم جو کوئی بھی ہو، ہمیں بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟"

شہزادہ بولا ”میں شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہُوں۔“

شہزادی نے بادشاہ سے کہا کہ یہ شخص، جو دِکھائی نہیں دیتا، جِنوں کے مُلک کا شہزادہ ہے۔ اگر آپ نے اِس کے ساتھ شادی نہ کی تو یہ آپ کے مُلک کو تباہ کر دے گا۔

بادشاہ ڈر گیا اور اُس نے اپنے وزیروں سے مشورہ کر کے شہزادے کی بات مان لی۔ شہزادی اور شہزادے کی شادی بڑی دھُوم دھام سے کر دی گئی۔ تین دِن خُوب جشن رہا۔ شادی کی تمام رسمیں پوری ہوئیں لیکن اِس دُوران میں شہزادے نے چادر اُوڑھے رکھی اور سب کی نظروں سے اوجھل رہا۔ چوتھے دِن شہزادے نے دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تلوار اُتاری، اُس کے دستے پر پہلے اپنا نام لکھا، پھر لکھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

یہ سب کُچھ لکھ کر اُس نے تلوار دیوار پر لگا دی۔ پھِر جادُو کے بوٹ پہنے، کیک اور پانی کی بوتل ساتھ لی اور واپس چل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک

ایسا مُلک آیا جہاں قحط پڑا ہُوا تھا۔ لوگ اِتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اُن کی ہڈّیاں نِکل آئی تھیں اور وہ ہڈیوں کے پنجر نظر آتے تھے۔ شہزادے نے جادُو کا کیک اُنہیں دے دیا۔ لوگ کھاتے گئے لیکن کیک ویسے کا ویسا ہی رہا۔ اس کے بدلے میں اُس نے لوگوں سے وعدہ لیا کہ اگر کبھی کوئی شہزادی اپنے بچّے کے ساتھ اِدھر سے گُزرے تو وہ اُس کی خوب آؤ بھگت کریں اور پھر اُسے اگلے مُلک کی سرحد پر چھوڑ آئیں۔

اِس کے بعد شہزادہ ایک ایسے مُلک میں داخل ہُوا جہاں برسوں سے بارش نہ ہوئی تھی، کنویں اور دریا سب سُوکھ گئے تھے۔ لوگ پانی کی بُوند کو ترس رہے تھے اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے۔ شہزادے نے پانی کی بوتل اُن لوگوں کو دے دی۔ اُنہوں نے خوب جی بھر کے پانی پیا، لیکن بوتل ویسی کی ویسی ہی رہی۔ یہاں بھی اُس نے لوگوں سے وعدہ لیا کہ اگر کبھی کوئی شہزادی اپنے لڑکے کے ساتھ اِدھر سے گزرے تو اُن کی پوری مدد کریں اور اگلے مُلک کی سرحد تک چھوڑ آئیں۔

اُدھر شہزادے کے جانے کے بعد شہزادی بُہت اداس ہو گئی تھی۔ اُس کا

کِسی کام میں دِل نہ لگتا تھا۔ اگلے موسمِ بہار میں اُس کے ہاں ایک خُوب صُورت شہزادہ پیدا ہُوا۔ وہ بہت ہی حسین تھا۔ سنہرے بال ، نیلی آنکھیں اور گُلابی رنگت۔ لڑکا بڑا ہو کر نہایت تَن دُرست اور صحت مند نِکلا۔ جب وہ چھ سال کا ہُوا تو ایک دِن اُس نے ماں سے ضِد کی کہ دیوار پر لٹکی ہوئی تلوار اُسے دِکھائی جائے۔ شہزادی نے تلوار اُتاری تو اُس کی نظر تلوار کے دستے پر لکھی ہُوئی تحریر پر پڑ گئی۔

یہ دیکھ کر اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کہ شہزادہ اپنا پورا پتا تلوار کے دستے پر لکھ گیا ہے۔ یہ تو وہی شہزادہ تھا جِس کے باپ کے باغ میں شہزادی ہنس بن کر جایا کرتی تھی۔

شہزادی نے اپنے لڑکے سے کہا "چلو بیٹا اب ہم تمہارے ابّو کی تلاش میں نکلتے ہیں۔۔۔۔" اگلے ہی دِن وہ روانہ ہو گئی۔ اُس کے ساتھ ایک فوجی دستہ، بے شمار نوکر چاکر اور سامان سے لدی ہُوئی گاڑیاں تھیں۔

جب وہ اُس مُلک میں پہنچے جہاں کے لوگوں کو شہزادے نے کیک دیا تھا تو

اُنہیں شہزادے سے کیا ہُوا وعدہ یاد آ گیا اور اُنہوں نے شہزادی اور اُس کے بیٹے کا شان دار اِستقبال کیا۔ پھر وہ شہزادی اور اُس کے ساتھیوں کو دوسرے مُلک کی سرحد تک چھوڑ آئے۔

یہ مُلک وہ تھا جِس کے باشندوں کو شہزادے نے پانی کی بوتل دی تھی۔ یہاں بھی شہزادی اور اُس کے ساتھیوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ یہ لوگ بھی شہزادی کو اگلے مُلک کی سرحد تک حفاظت سے پہنچا آئے۔ ایک دِن کا سفر کرنے کے بعد شہزادی شہزادے کے شہر کے نزدیک پہنچ گئی لیکن وہ شہر میں داخل نہیں ہوئی۔ بلکہ اُس سے کُچھ فاصلے پر ایک کھُلے میدان میں رُک گئی۔

میدان میں خیمے لگا دیے گئے، قالین بچھا دیے گئے اور تمام قیمتی اور خُوب صُورت سامان اور جو شہزادی ساتھ لائی تھی، سجا دیا گیا۔ پھر شہزادی نے بادشاہ کو پیغام بھجوایا کہ میں مُلک کہکشاں کی شہزادی ہُوں اور آپ کی بہو بننا چاہتی ہوں۔ مہربانی فرما کر اپنے بیٹوں کو باری باری میرے پاس بھیجیے تاکہ میں اُن میں سے ایک کو چُن لُوں۔

سب سے پہلے بڑا شہزادہ بن سنور کر نِکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادی سے ملنے گیا۔ شہزادی کے بیٹے نے پُوچھا:

"امّی، کیا یہ میرے ابّو ہیں؟"

شہزادی بولی "نہیں بیٹے۔ یہ تمہارے ابّو نہیں ہیں۔"

بڑا شہزادہ واپس چلا گیا تو دوسرا شہزادہ قسمت آزمانے آیا۔ اُسے دیکھ کر بھی لڑکے نے وہی سوال کیا۔ شہزادی نے جواب دیا کہ بیٹے، یہ بھی تمہارے ابّو نہیں ہیں۔

سب سے آخر میں چھوٹا شہزادہ گھوڑا دوڑاتا ہُوا آیا۔ شہزادی نے خیمے کے اندر ہی سے پہچان لیا اور لڑکے کو بتایا کہ بیٹے، یہی تمہارے ابّو ہیں۔

لڑکا بھاگ کر خیمے سے باہر نِکلا اور اپنے باپ سے لپٹ گیا۔ خُوشی کے مارے شہزادی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تینوں دیر تک باتیں کرتے رہے، اور جب ایک دوسرے کو سارا قصّہ سُنا چکے تو شہزادہ اُن کو لے کر اپنے محل میں آ گیا۔ اُس کے بھائی یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ یہ

سُست اور نالائق لڑکا شہزادی کو کیسے پسند آ گیا۔ لیکن اُنہیں کیا پتا تھا کہ شہزادی کو حاصل کرنے کے لیے اُس نے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔

شہزادی اور شہزادہ وہاں زیادہ دِنوں نہیں رُکے، فوراً ہی کہکشاں کی طرف چل پڑے جہاں شہزادے نے بہت عرصے تک حکومت کی اور شاید آج بھی وہاں اُسی کی نسل حکومت کر رہی ہو۔ لیکن ہمیں اِس بات کا ٹھیک پتا نہیں چل سکتا کیوں کہ کہکشاں تک جانا آسان نہیں۔ وہاں تو وہی پہنچ سکتا ہے جو پہلے چاند اور سُورج کے پاس سے گُزرے۔ پھر کُچھ ہواؤں سے راستہ پُوچھنے کے بعد ساتویں ہوا کے ساتھ ایسے جوتے پہن کر سفر کرے جو ایک قدم میں سات میل کا فاصلہ طے کرتے ہوں۔ پھر ویران صحراؤں اور برفانی پہاڑوں میں سے گُزرے۔ تب کہیں جا کر اُسے پتا چلے گا کہ کیا مُلک کہکشاں پر آج بھی اُسی شہزادے کی نسل حکومت کرتی ہے۔

اشرفیوں کا صندوق

ایک زمیں دار تھا، بہُت امیر۔ گاؤں کی ساری اچھّی اور زرخیز زمینیں اُس کی ملکیت تھیں۔

اِن زمینوں کے سِرے پر ایک ٹکڑا ایسی بنجر زمین کا تھا جِس میں کُچھ پیدا نہ ہوتا تھا۔ زمیں دار نے سوچا، اِس زمین سے کوئی فائدہ تو ہوتا نہیں، کیوں نہ اِسے کِسی غریب کسان کو دے کر اُس پر اِحسان جتایا جائے۔ اگر اُس کی محنت سے زمین اچھّی ہو گئی اور فصل دینے لگی تو پھِر واپس لے لوں گا۔

زمین دار کی زمینوں پر بہُت سے کسان کام کرتے تھے۔ اُن میں سے اُس نے ایک ایسا کسان چُنا جِس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ اگر کبھی زمین واپس لینی پڑے تو چُپ چاپ واپس کر دے گا۔

زمیں دار نے کسان کو بُلایا اور کہا "میں اپنی زمین کا وہ ٹکڑا جو ٹیلے کے پاس ہے، تمہیں دیتا ہوں۔ میرا اِس سے اب کوئی تعلّق نہیں۔ تُم محنت کر کے اُسے ٹھیک کرو۔ اُس میں تُم جو بھی فصل اُگاؤ گے، وہ تمہاری ہو گی۔"

کسان نے زمیں دار کا شکریہ ادا کیا اور اگلے ہی دِن زمین پر کام شروع کر دیا۔ اُس نے ایک ہفتے لگاتار محنت کر کے زمین میں سے کنکر، پتھر اور گھاس پھونس صاف کیا اور پھر اُس میں ہل چلانا شروع کیا۔ لیکن ایک جگہ ہل کِسی چیز میں اٹک گیا۔ اُس نے ہل روک لیا اور اُس چیز کو نِکالنے کے لیے اُس جگہ زور سے پھاوڑا مارا۔

جوں ہی پھاوڑا زمین پر لگا، ایسی آواز آئی جَیسے لوہا لوہے سے ٹکراتا ہے۔ وہ بڑا حیران ہُوا کہ زمین کے اندر لوہے کا کیا کام! اُس نے پھاوڑا پھینک دیا اور بیلچے سے آہستہ آہستہ زمین پر سے مٹّی ہٹانے لگا۔

کوئی فُٹ بھر مٹّی ہٹانے کے بعد اُس نے ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو یوں محسُوس ہُوا جیسے لوہے کا صندوق ہے۔ اُس نے جلدی جلدی مٹّی ہٹائی۔

واقعی وہ صندوق تھا۔ اب تو اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔

اُس نے صندوق کے چاروں طرف کی مٹّی کھودی اور پورے زور سے صندوق کو ہلایا۔ لیکن وہ اتنا بھاری تھا کہ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس میں ایک موٹا سا تالا پڑا ہُوا تھا۔ کسان نے پھاوڑا تالے پر مارا تو وہ ٹوٹ گیا۔

اُس نے جلدی جلدی ڈھکن اُٹھایا۔ مارے حیرت کے اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ صندوق میں سونے کی اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔ کسان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا- اُس نے اشرفیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ واقعی سونے کی اشرفیاں تھیں۔ اس نے پھر ایک بار اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ اُس نے ایک اشرفی اُٹھا کر جیب میں ڈالی، صندوق کو بند کیا اُس کے اُوپر مٹّی ڈال کر زمین برابر کر دی۔ آدمی سمجھدار تھا۔ اُس نے سوچا اگر جلد بازی سے کام کیا تو ساری دولت ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ وہ چُپ چاپ ہل چلاتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ سوچتا رہا کے اِس صندوق کو یہاں سے لے جانے میں کِس سے مدد لے۔

آخر وہ اِس فیصلے پر پہنچا کہ سوائے بیوی کے اور کسی کو یہ راز نہ بتانا چاہیے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اُس کی بیوی پیٹ کی بہت ہلکی تھی۔ وہ جب بھی اپنی بیوی کو کوئی راز کی بات بتاتا، وہ سارے گاؤں میں اُسے پھیلا دیتی۔

سوچ سوچ کر کسان نے اُس کا بھی حل ڈھونڈ لیا. وہ شہر گیا اور ایک سُنار کے ہاتھ اشرفی فروخت کی۔ سُنار نے اُسے اتنے روپے دیے کہ اُس کی جیبیں بھر گیئں۔

اب وہ پکوڑوں کی دُکان پر گیا اور ایک من پکوڑے خریدے۔ پکوڑے لے کر وہ اپنے کھیت میں گیا اور سارے کھیت میں پکوڑے بکھیر دیے۔

اس کے بعد وہ پھِر شہر گیا اور بازار سے دو سو سموسے، ایک جھاڑو اور چار کبوتر خریدے۔ پھِر ایک مزدُور سے یہ سب چیزیں اُٹھوا کر گھر آ گیا۔ لیکن گھر میں داخل نہ ہوا، بلکہ پچھلی دیوار سے چھت پر چڑھ کر سارا سامان رسّی میں باندھ کر اُوپر کھینچ لیا۔ اُس کی بیوی کو کانوں کان خبر نہ

ہُوئی۔

اَب کسان نے ساری چھت اور منڈیروں پر پکوڑے بکھیر دیے۔ پھِر سیڑھیوں پر پکوڑے بکھیرتا ہُوا نیچے آیا اور جھاڑو اور کبوتر ایک کمرے میں چھُپا دیے۔

اُسے دیکھتے ہی اُس کی بیوی کہنے لگی ”تُم کو تو بس گھر کی کُچھ پرواہی نہیں ہے۔ اُس بے کار زمین پر سارا دِن وقت ضائع کرتے رہتے ہو۔ میں پُوچھتی ہوں، کیا ہم ہمیشہ یوں ہی بھوکے رہیں گے؟ اُس زمین کو چھوڑو۔ کوئی اور کام کرو، جس سے چار پیسے ہاتھ آئیں؟“

کسان بولا ”اری نیک بخت، ذرا صبر تو کر۔ مُجھے سانس تو لینے دے۔ تھکا ہارا آرہا ہوں، اور تُو نے اُوپر سے باتیں بنانا شروع کر دیں۔ لا، کُچھ کھانے کو دے۔“

بیوی بولی ”کھانے کو کیا دوں؟ گھر میں کُچھ تھا ہی نہیں جو پکاتی۔ ہمسایوں کے ہاں پُوچھتی ہوں۔ شاید اُن کے پاس کُچھ فالتو بچ رہا ہو۔“

یہ کہہ کر وہ چھت پر جانے کے لیے سیڑھی پر چڑھی تو پکوڑے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چھت پر پہنچی تو وہاں بھی ہر طرف پکوڑے پڑے تھے۔ وہ وہیں سے چلائی "ارے۔۔۔! ارے۔۔۔! اِدھر آؤ۔" کسان نے کہا "کیا ہے؟"

بیوی بولی ”دیکھو، آج ہمارے گھر پکوڑوں کی بارش ہُوئی ہے۔ ذرااوپر تو آؤ۔۔۔“

کسان اوپر جاکر بولا ”واقعی۔ یہ تو کمال ہو گیا۔ انہیں اکٹھّا کر لو۔ ایک ہفتہ آرام سے کھائیں گے۔“

جب وہ پکوڑے کھا رہے تھے تو کسان نے کہا ”میں تمھیں ایک خوش خبری سُناتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ بات تمہارے سوا کسی اور کو معلوم نہ ہو۔“

بیوی بولی ”تُم پوری تسلّی رکھو۔ میں ِکسی سے ذِکر نہ کروں گی۔“

اِس پر کسان نے بیوی کو صندوق والی بات بتا دی ۔ لیکن پکوڑوں ، سموسوں، جھاڑو اور کبوتروں کے بارے میں کُچھ نہ بتایا۔

اِتنی دولت کا خیال کر کے کسان کی بیوی کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ بولی ” چلو، ابھی اُٹھا لاتے ہیں وہ صندوق۔۔۔“

کسان بولا ”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ رات تو ہو لینے دو۔“

اندھیرا ہُوا تو دونوں گھر سے باہر نکلے۔ کسان نے کہا "پہلے تم جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔"

بیوی چلی گئی تو کسان نے جلدی جلدی کبوتروں کو ذبح کیا اور اُن کے خون میں جھاڑو کو خوب تو کرلیا۔ پھر بھاگ کر بیوی سے آمِلا۔

دونوں زمین کی طرف جا رہے تھے کہ کسان نے چپکے سے جھاڑی ہلائی، جِس سے خُون کے چھینٹے اُڑ کر اُس کی بیوی کے کپڑوں پر پڑے۔ بیوی نے کپڑے دیکھے تو بولی:

"ارے آسمان تو بالکل صاف ہے۔ تارے نکلے ہوئے ہیں۔ یہ بارش کہاں سے ہوئی ہے؟"

کسان بولا "صاف موسم میں بارش ہو تو پانی کے بجائے خُون برستا ہے۔"

یُوں ہی باتیں کرتے ہوئے وہ اپنی زمین پر پہنچ گئے۔ کھیت میں قدم رکھتے ہی کسان کی بیوی چلّائی:

"ارے ارے یہ دیکھو! یہ تو سموسوں کی بارش ہُوئی ہے!"

یہ کہہ کر اُس نے سموسے اُٹھا اُٹھا کر کھانے شروع کر دیے۔

اس کے بعد دونوں نے اشرفیوں کا صندوق نِکالا اور خاموشی سے گھر کی طرف چل دیے۔ راستے میں زمین دار کی حویلی پڑتی تھی۔ کسان اور اس کی بیوی حویلی کے پاس سے گزرے تو حویلی کے چوکی دار کے کراہنے کی آواز آئی۔ کسان جانتا تھا کہ چوکی دار کافی عرصے سے بیمار ہے۔ بیوی نے پُوچھا:

"یہ کون رو رہا ہے؟"

کسان بولا "سُنا ہے ایک جِن زمیندار کو اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اِسی لِیے اُس کے بیوی بچّے رو رہے ہیں۔"

گھر پہنچ کر کسان نے زمین کھودی اور بیوی کی مدد سے اشرفیوں والا صندوق اُس میں دبا دیا۔ صُبح اُٹھتے ہی کسان کی بیوی نے کسان سے مُطالبہ شروع کر دیا کہ اُسے اچھے اچھے کپڑے اور زیوات بنانے کے لیے کُچھ اشرفیاں دے۔ لیکن کسان ڈرتا تھا کہ اگر اِس طرح انھوں نے روپیہ

خرچ کیا تو لوگ سوچیں گئے کہ اِن کے پاس اچانک اتنی دولت کہاں سے آگئی۔ دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی فضول دولت اُڑانی شروع کر دے۔ اُس نے اشرفیاں دینے سے انکار کر دیا۔

بیوی اپنی عادت کے مطابق شوہر سے خوب لڑی اور پھر ناراض ہو کر پڑوس میں جا بیٹھی۔ کسان نے زمین میں سے صندوق نکالا اور صحن کے کونے میں نیا گڑھا کھود کر اُس میں دفن کر دیا۔

شام کو کسان کی بیوی واپس آئی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہمسائے کی بیوی آئی اور کسان کی بیوی نے اُس سے کہا ''بہن میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تُم اِس کا ذکر کِسی اور سے نہ کرنا۔''

ہمسائی نے اُسے یقین دِلایا کہ وہ کِسی سے نہ کہے گی تو کسان کی بیوی نے اُسے اشرفیوں والے صندوق کی بات بتا دی۔

عورتوں کے پیٹ میں کوئی بات نہیں ٹھہرتی۔ ہمسائی نے وہ بات کِسی اور

کو بتادی، اور یوں ہوتے ہوتے یہ بات تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ زمیندار کے کان میں بھی اس کی بھِنک پڑ گئی۔

زمیندار غُصّے سے بپھرا ہُوا کسان کے گھر آیا اور بولا "تُو بُہت دھوکے باز اور بے ایمان ہے۔ میں نے تیری غربت کا خیال کر کے تجھے زمین دی۔ اس زمین میں سے اشرفیوں کا صندوق نِکلا تو تجھے چاہیے تھا کہ فوراً میرے حوالے کر دیتا۔ کہاں ہے وہ صندوق؟"

کسان پہلے تو گھبرایا لیکن پھر گھبراہت پر قابو پا کر کہا "حضور، میری کیا مجال کہ ا، تنی بڑی دولت ہاتھ آتی اور میں آپ سے چھپاتا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

زمین دار گرج کر بولا "سارا گاؤں اِس بات کو جانتا ہے۔ تیری بیوی نے سب کو بتا دیا ہے۔ وہ خود تیرے ساتھ وہ صندوق اُٹھا کر لائی ہے۔ زیادہ چالاکی مت کر۔ جلدی بتا، کہاں ہے وہ صندوق؟"

کسان نے زمیندار کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "حضُور یہ بڑی جھوٹی

عورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ ہمیشہ مُجھ سے لڑتی رہتی ہے۔ یہ بات بھی اس نے مجھے بدنام کرنے کے لیے گھڑی ہے۔"

کسان کی بیوی، جو اب تک چُپ بیٹھی تھی ایک دم برس پڑی "کیوں جھُوٹ بولتے ہو۔ اُس دِن مُجھے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے؟"

کسان نے کہا "کِس دِن کی بات کر رہی ہو؟"

بیوی بولی "جس دِن شام کو پکوڑوں کی اور رات کو سموسوں کی بارش ہوئی تھی۔"

کسان کی بیوی کی یہ بات سُن کر زمیندار نے سوچا کہ کہیں اِس عورت کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کبھی پکوڑوں اور سموسموں کی بارش بھی ہوئی ہے!

کسان اپنی سکیم کی کامیابی بہت خوش تھا۔ اُس نے بیوی سے کہا "اور کیا ہُوا تھا اُس دِن؟"

بیوی بولی "خُون کی بارش ہوئی تھی۔ اور کیا ہونا تھا۔"

زمیندار نے کسان سے کہا "کیسی باتیں کر رہی ہے تیری بیوی۔ خُون کی بارش تو ہم نے نہ کبھی سُنی نہ دیکھی۔"

کسان نے کہا "یہ ہمیشہ ایسے ہی بَک بَک کرتی رہتی ہے۔" پھر اُس نے اپنی بیوی سے کہا "کُچھ اور یاد ہو تو وہ بھی بتاؤ۔۔۔۔"

"ہاں ہاں" بیوی بولی "اُس دِن ایک جِن زمیندار صاحب کو اُٹھا کر لے گیا تھا اور حویلی میں لوگ رو رہے تھے۔۔۔"

یہ سُنتے ہی زمیندار کو غصّہ آ گیا۔ اُس نے اپنے ملازموں سے کہا "اِس چُڑیل کی خُوب مرمت کرو۔ کِسی جِن کی جرأت ہے کہ مُجھے اُٹھا کر لے جائے۔ اِس کم بخت نے جوٹھ بول کر غریب کسان کو ناحق بد نام کیا۔۔۔"

کسان کی بیوی بولی "حضُور، آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں۔ میں آپ کو وہ جگہ دکھاتی ہوں جہاں ہم نے صندوق دبایا تھا۔۔۔"

زمیندار کے حکم سے مُلازموں نے وہ جگہ کھودی جہاں کسان کی بیوی کے

مطابق اشرفیوں کا صندوق دبایا گیا تھا۔ لیکن وہاں سے کُچھ بھی نہ نِکلا۔

اب تو زمیندار کو یقین ہو گیا کہ اِس عورت کے دماغ میں ضرور کوئی خرابی ہے۔ وہ غصّے سے پیر پٹختا ہُوا چلا گیا۔

کسان نے بیوی سے کہا "اب کیا خیال ہے ؟ اور بتاؤ لوگوں کو یہ بات اور خُوب جُوتے کھاؤ۔"

بیوی اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھی۔ اب اُسے احساس ہُوا کہ غیر لوگوں پر اعتبار کرنے کے بجائے اپنے شوہر پر اعتبار کرنا درست ہوتا ہے۔ اُس نے شوہر سے معافی مانگی اور آئندہ کبھی گھر کی بات کِسی کو نہ بتائی۔ کُچھ عرصے بعد وہ دونوں گاؤں چھوڑ کر شہر چلے گئے اور وہاں ہنسی خوشی رہنے لگے۔